JULY
2023

جدید ادب کا نمائندہ
ماہنامہ
لاہور

جشنِ جون ایلیا میں معروف شاعر ادیب جناب خالد احمد کے فن اور شخصیت پر ایک سیشن میں شریک
جناب اعجاز ثاقب، جناب عباس تابش، جناب اسرار چشتی، جناب نعمان منظور اور جناب سلیم ساگر

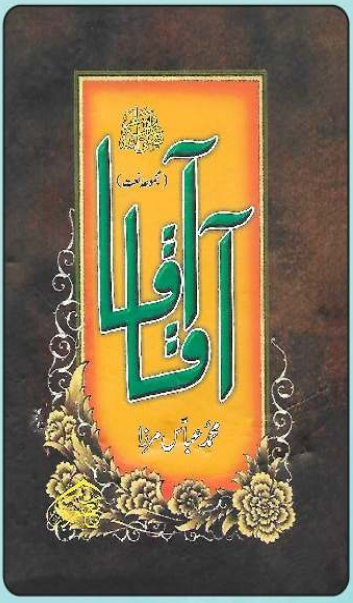

آقا
(مجموعہ نعت)
محمد عباس مرزا

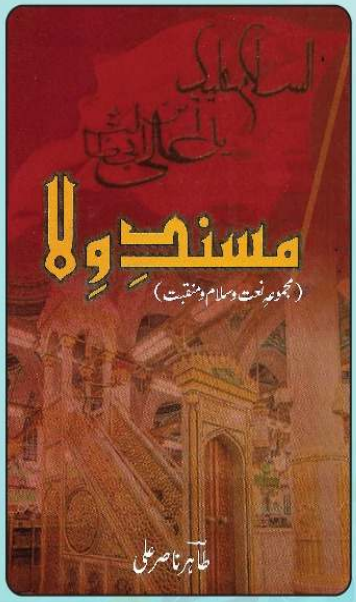

مسندِ ولا
(مجموعۂ نعت وسلام ومنقبت)
طاہر ناصر علی

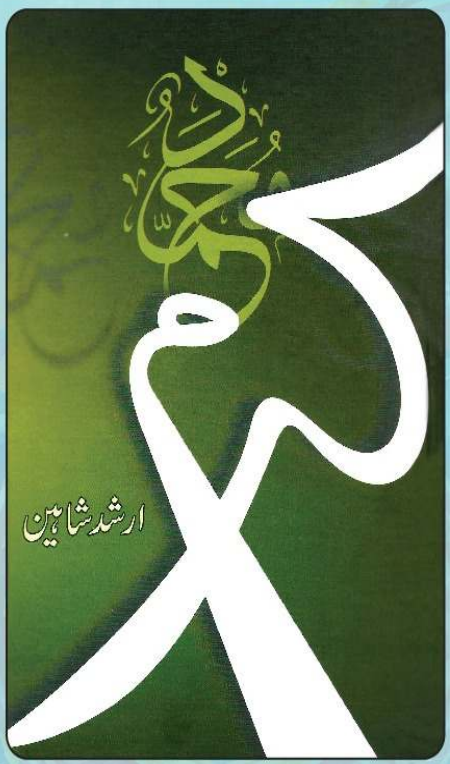

ارشد شاہین

غزل

یہ لوگ تو آنسو بھی بہانے نہیں دیتے
نیکی کو بھی دریاؤں تک آنے نہیں دیتے

ہر ہاتھ پہ دھر دیتے ہیں عمروں کا تحیّر
یہ لوگ تو آنکھیں بھی چرانے نہیں دیتے

آتے ہوئے دن کے لیے گزرے ہوئے دن پر
ہم کو صفِ ماتم بھی بچھانے نہیں دیتے

یہ لوگ فقط ہاتھ پکڑنے پہ ہیں مامور
پتھر بھی یہ بچوں کو اُٹھانے نہیں دیتے

کیا لوگ ہیں کیا ٹھانے ہیں اللہ ہی جانے
احسان بھی اپنے یہ گنانے نہیں دیتے

اس چھت سے کبھی دُھوپ اُترتی نہیں خالد
عزت تو یہ دیتے ہیں گھرانے نہیں دیتے

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-6
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 31 - جولائی 2023 - شمارہ نمبر: 7

ایڈیٹر: عمران منظور

مجلس ادارت

اعجاز رضوی	نعمان منظور	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاوید احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: جشنِ جون ایلیا

قیمت: 100 روپے

سالانہ زرِ اعانت 1000 روپے بیرونِ ملک 100$ پاکستانی روپے میں

فیصل بینک لمیٹڈ

ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور

اکاؤنٹ نمبر: 02560070000002582

بیاض گروپ آف پبلیکیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور- 53700

فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ www.trackntie.com BAYAZ

عمران منظور پرنٹر پبلشر اور ایڈیٹر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	محمد انیس انصاری	7
2	نعت	سید ریاض حسین زیدی، نسیم سحر، خاور اعجاز صفدر صدیق رضی، سید عارف معین بلے، فیض رسول فیضان ریاض ندیم نیازی، سرور حسین نقشبندی، دانش عزیز	8 تا 16
3	عقیدت	اکرم ناصر، نیّر سرحدی، دانش عزیز، اعجاز دانش، مرزا آصف رسول	17 تا 21
4	رباعیات	گلزار بخاری	22
5	ماہیے	خاور اعجاز	23 تا 24
6	ہائیکوز	ظلہ غفور	25
7	مضامین	فرحت عباس شاہ، ظفر معین بلے جعفری، سعد اللہ شاہ آفتاب خان، شاہدہ دلاور شاہ، خالد صدیقی، سائل نظامی نبیل احمد نبیل، صدام ساگر، فیصل زمان چشتی	26 تا 76
8	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	77 تا 85
9	شاعرِ امروز	عزیر یوسف [شاہد مالکی]	86 تا 87
10	غزلیں	خالد احمد، جلیل عالی، سید ریاض حسین زیدی، خاور اعجاز، نسیم سحر راحت سرحدی، محمد انیس انصاری، گلزار بخاری، طارق بٹ، محسن اسرار شوکت محمود شوکت، تیوم طاہر، اقبال سرویہ، مسعود احمد، اکرم سحر فارانی	88 تا 182

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
10	غزلیں	احمد جلیل، شہاب صفدر، شبہ طراز، اشرف نقوی، میتھیو محسن فرحت زاہد، محمد شفیق، ہمایوں پرویز شاہد، افتخار شاہد، رخشندہ نوید انصر حسن، اعجاز دانش، رانا سعید دوشی، ذکی طارق، شبیر ناز ش محمود کیفی، افتخار شوکت، آفتاب خان، اشرف کمال، شاہد ماکلی مرزا سکندر بیگ، اعظم کمال، محمد افضال انجم، علی حسین عابدی امر مہکی، محمد اشفاق بیگ، بشیر احمد حبیب، نبیل احمد نبیل، عقیل شانی وسیم جبران، حسن پرویز سیّد، اکرم جاذب، رضا اللہ حیدر، علمدار حسین شاہد فرید، ارشد محمود ارشد، عمر قیاز قائل، فیض رسول فیضان عقیل رحمانی، محمد کلیم، اجمل اعجاز، راجہ عبدالقیوم، افضل ہزاروی محمد نور آسی، اصغر علی بلوچ، اکرم ناصر، ظہور چوہان، احمد محمود الف عاجز، امتیاز انجم، خالد ندیم شانی، دانش عزیز، صائمہ آفتاب عابد معروف مغل، آفتاب محمود شمس، خالق آرزو، فہمیدہ مقبول رخسانہ سمن، رانا غلام محی الدین، ملیحہ سیّد، سرفراز عارض، جیا قریشی کوکل گل، زبیر خیالی، عنبرین خان، شہباز سرور، یاسر رضا آصف سمیرا یوسف، مستحسن جامی، زاہد خان، سید تیمور کاظمی، شہاب اللہ شہاب عدنان خالد، ساجد رضا خان، عاصم بخاری، فرخ شاہد، نائلہ راٹھور زبیر فاروق، رجب علی رجب، طلحہ غفور، فخر عظیم، عزیز قدیر مغل	88 تا 182
11	افسانے	ابدال بیلا، حنیف باوا، تسنیم کوثر، کلیم خارجی فصیح آصف خان، حمزہ حسن شیخ [سیسیلیا اونگ، کوچنگ]، نجم رضوی	183 تا 215
12	طنز و مزاح / خاکے	نور کمال شاہ، راجہ عبدالقیوم	216 تا 221
13	نظمیں	خالد احمد، جلیل عالی، نسیم سحر، گلزار بخاری، صفدر صدیق رضی فرخندہ شمیم، شاہین عباس، رخشندہ نوید، سید تیمور کاظمی، امجد بابر فرح شاہد، صغیر احمد صغیر، ریحانہ قمر، نائلہ راٹھور، عاصم بخاری سمیرا یوسف، آفرینہ آفریں، رفعت انجم، اعجاز رضوی	222 تا 241

حمد

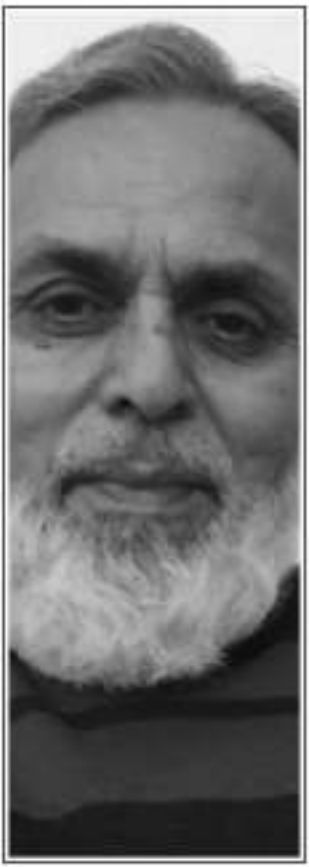

وہ شمعِ انجمن ، حسنِ چمن ہے
اُسی سے کارِ ہستی کا چلن ہے

اُسی کی گونج مٹی میں رچی ہے
اسی سے خاک کو اذنِ سخن ہے

یہ جس سے قصرِ جاں میں روشنی ہے
یہی اک شعلگی میراثِ من ہے

مرے اطراف شعلے ہیں ، دھواں ہے
مگر وہ ہر نفس رحمت فگن ہے

اُسی سے قوتِ تخلیق زندہ
اُسی سے آبروئے فکر و فن ہے

محمد انیس انصاری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دیکھتا کون ایک پل رُک کر
رقصِ یارانِ بے سر و دستار

نعتؐ

یاد ان کی ہے اپنا سرمایہ
اور تو کچھ نہ میرے کام آیا

بھیجتا ہوں درود ان پہ مدام
کیسا کارِ خدا ہے اپنایا

ہیں دل و جاں پہ ان کی تصویریں
سب جہانوں کو میں کما لایا

ان کو سوچوں تو چین پڑتا ہے
زخم کاری فراق کا کھایا

آپؐ پر سایہ ابر رحمت کا
ساری دنیا پر آپؐ کا سایہ

آنکھ رہتی ہی جالیوں پر ہے
کیسا سودا ہے دل کا من بھایا

نعت جب بھی ادا ہوئی لب سے
دل پہ قوسِ قزح کا رنگ آیا

ہو ریاض کرم میں ہریالی
ابر رحمت یہاں رہے چھایا

سید ریاض حسین زیدی

نعت

دِل اور روح میں نہ ذرا بھی خلا رہے
یوں جاگزیں خیالِ شہِ دَوسَرا رہے

پیشِ نظر مِرے نہ کچھ اِس کے سِوا رہے
عشقِ رسولؐ پاک ہو، خوفِ خدا رہے

باقی کوئی خیال نہ دِل میں مکین ہو
''انساں کو چاہئے کہ خیالِ قضا رہے''

باقی تمام رستے اگر بند ہوں تو کیا!
حرمین کی طرف کا جو رستہ کھُلا رہے

یارب مِرے قلم پہ بھی، نوکِ زباں پہ بھی
یا حمد ہو، یا مدحتِ خیر الوریٰ رہے

سرشاریاں نہ ختم ہوں عشقِ رسولؐ کی
ہر انتہا سے ایک نئی ابتدا رہے

طیبہ سے اپنے ساتھ جو آیا ہوں لے کے مَیں
چاروں طرف مِرے وہی آب و ہوا رہے

جی چاہتا ہے گنبدِ خضرا کو دیکھ کر
تا عمر آدمی بس اُسے دیکھتا رہے!

یوں جانئے خدا کی رضا بھی عطا ہوئی
ملحوظ اگر رضائے رسولِ خدا رہے

ہونٹوں پہ ذائقہ ہے جو عجوہ کھجور کا
شیرینیِ سخن میں ہمیشہ گھُلا رہے

کچھ اَور کیا نسیمِ سحر کی ہے آرزو!
بس اِس قدر، دوبارہ مدینے میں جا رہے

نسیمِ سحر

نعتؐ

ہزار مرحلے طے کر کے شاعری گزرے
پھر ایک سطر کہیں جا کے نعت کی گزرے

وہاں وہاں پہ کھِلے پہلے پہلے روشن پھول
جہاں جہاں سے بھی وہ آخری نبیؐ گزرے

سجود کرتی ہُوئی جائے شب کی تاریکی
سلام کرتی ہُوئی دن کی روشنی گزرے

مجھے بھی اذنِ سفر ہو دیارِ طیبہ کا
حضورؐ آپ کے قدموں میں زندگی گزرے

حضورؐ آپ کا اسمِ گرامی ہو لب پر
مرے وجود سے جب موت کی گھڑی گزرے

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اے ماحیؐ غمِ دل و دنیا! ترے لیے
محوِ دعا رہے رُسلِ ذوالمنن تمام

نعتؐ

خدائے ارض و سما کو تجھے بنانا تھا
یہ کائنات، یہ کون و مکاں بہانہ تھا

چمن بنائے گئے اور گل کھلائے گئے
کہ تجھ کو عرشِ بریں سے زمیں تک آنا تھا

ترے غیاب میں تیرے حضور آئے ہم
خدا سے پہلے تو ایمان تجھ پہ لانا تھا

کس آرزو سے بلایا گیا شبِ معراج
خدا کا عشق بھی کیا تجھ سے دلبرانہ تھا

تو نگروں کے لیے خاکِ در تھی سُرمۂ چشم
غریب کے لیے تیرا کبیر خانہ تھا

سفر شروع کیا ہم نے جب غدیر کے بعد
ہماری پیشروی کو ترا گھرانا تھا

صفدر صدیق رضی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تو نے ہر ذرّے کو سورج سے ہم آہنگ کیا
تو نے ہر قطرے میں اک بحر کی وسعت لکھی

نعتؐ

مجھے معلوم ہے اِتنا، نہیں معلوم کیا تُم ہو
ازل کی ابتدا تُم ہو، ابد کی انتہا تُم ہو

تمھارا نُور ہے جاری و ساری بزمِ امکاں میں
دلِ یزداں کی دھڑکن، قلبِ دُنیا کی صدا تُم ہو

نہیں ہے تاج سر پر اور سر تاجِ دو عالم ہو
ہے مسند بوریا لیکن شہِ ہر دو سرا تُم ہو

مٹایا ہے بشر کے "شر" کو، جس نے خیر سے آ کر
وہی خیر البشر تم ہو، وہی خیر الوریٰ تُم ہو

جُدا تھے طور کوہِ طُور پر لیکن شبِ اسریٰ
جو تم پہنچے، کہا اہلاً و سھلاً مرحبا، تُم ہو

تمھارے سامنے باندھے کھڑے ہیں ہاتھ پیغمبر
یقیناً اشرفِ کعبہ، امام الانبیاءؐ تُم ہو

مدثر نام ہے لیکن ردا ہے سر پہ بوسیدہ
لقب اُمّی ہے گرچہ، محرمِ سِرِّ علیٰ تُم ہو

احاطہ ہو تو کیونکر ہو تمھاری ذاتِ اقدس کا
نہیں ہو تُم خدا لیکن، سبھی کچھ باخدا تُم ہو

بچھا کر راہِ اقدس میں ستارے آسمانوں پر
شبِ اسریٰ خُدا نے جس کا دیکھا راستہ، تُم ہو

ہمارا ارتقاء منت کشِ معراج ہے عارف
بالفاظِ دِگر تحریکِ تسخیرِ خلا تُم ہو

سید عارف معین بلے

نعت

محبوبِ کبریا کی ہے تعظیم حشر تک
خم ہے خدائی کا سرِ تسلیم حشر تک

مخلوق میں خدائے دوعالم کی نعمتیں
فرمائیں گے حضور ہی تقسیم حشر تک

اُن سے بڑا نہیں ہے سخی کائنات میں
تخصیص حشر تک ہے یہ تعمیم حشر تک

قرآن اور حدیث ہیں چشمے بھلائی کے
ہے مخزنِ فلاح یہ تعلیم حشر تک

نسبت رسول کی ہے بشارت قبول کی
ہے اُن کے ہر غلام کی تکریم حشر تک

زیبا ہے اُن کو ختمِ نبوت کا تاجِ نور
کونین پر محیط یہ تقدیم حشر تک

سرکار ہر زمان و مکاں کے رسول ہیں
ہے دست بستہ دہر کی تقویم حشر تک

وردِ زباں ہے اسمِ محمدؐ زہے نصیب
پیمانۂ کرم ہیں یہ دو میم حشر تک

فیضانؔ دیکھ گنبدِ خضریٰ کو شوق سے
کیا خوب رحمتوں کی ہے تجسیم حشر تک

فیض رسول فیضان

نعتؐ

حضور اِذنِ حاضری کا آپ سے سوال ہے
کہ اِذن کے بغیر میری حاضری محال ہے

مجھے تو خاکِ روضۂ نبی کی آرزو ہے بس
کہ میرے زخم زخم کا یہی تو اِندمال ہے

جمال ہی جمال ہے حضور آپ کی نظر
حضور یہ غریب دل بھی طالبِ جمال ہے

فراق کے عذاب سے نجات دیجیے مجھے
میں جاں بہ لب ہوں جانے کب سے خواہشِ وصال ہے

درِ حضور پر سناؤں جا کے اپنی نعت میں
اِس آرزو میں جانے کب سے دل مرا نڈھال ہے

بہت ہی سخت ہو گئے ہیں زندگی کے روز و شب
مگر ہمارے پاس اِسمِ مصطفیٰ کی ڈھال ہے

حضور اب تو اپنے اِس ندیم کو بچایئے
کہ اِس کے اِردگرد کتنی نفرتوں کا جال ہے

ریاض ندیم نیازی

نعت

اس لئے بھی نیا زمانہ ہے
آپ کا نقشِ پا زمانہ ہے

آپ سے نبضِ کائنات رواں
آپ کا معجزہ زمانہ ہے

حشر تک جو بھی آنے والا ہے
یا نبی آپ کا زمانہ ہے

سبز گنبد ہے سامنے سرور
روشنی سے بھرا زمانہ ہے

بھول بیٹھے ہیں جادۂ سیرت
اور یہ کہتے ہیں کیا زمانہ ہے

رفعتیں ہر گھڑی اترتی ہیں
گویا مدحت سرا زمانہ ہے

جو بھی اپنائے آپ کی سیرت
وہ زمانہ کھرا زمانہ ہے

آپ کے راستے پہ چلتا ہوں
ہاتھ پر یوں دھرا زمانہ ہے

آپ کے دم سے ہے پذیرائی
ورنہ کس کا ہوا زمانہ ہے

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

اپنی چوکھٹ کے گداؤں میں بٹھا سکتے ہیں
آپؐ جب چاہیں مجھے در پہ بُلا سکتے ہیں

سَر جو سَرکارؐ کے قدموں میں جُھکایا مَیں نے
کٹ تو سکتا ہے کہاں لوگ اُٹھا سکتے ہیں

دِل سے اُٹھے گی صَدا صلے علیٰ صلے علیٰ
ناقدیں کب مِری آواز دبا سکتے ہیں

جَب میں اُمید کے پنگھٹ پہ پُکاروں اُنؐ کو
دُور زمزم سے مِری پیاس بجھا سکتے ہیں

مجھ کو دُنیا نے سمجھ رکھا ہے تنہا آقاؐ
آپؐ چاہیں تو مِری بات بنا سکتے ہیں

تذکرہ آپؐ کا سُن لیں تو یقیں ہے میرا
اپنے سَر آج بھی اَشجار جُھکا سکتے ہیں

میرے لہجے کی رَوانی مِری خوبی ٹھہری
مَیں نے بَس اِتنا کہا صلے علیٰ ، سکتے ہیں !

فخر سے کہتا ہے ہوں مَیں شاملِ امت دانش
حَشر میں کیسے مجھ اَیسے کو بُھلا سکتے ہیں

دانش عزیز

عقیدت

ہو مجھ کو عطا اذنِ ملاقات نبیؐ جی
کرنا ہے مجھے آپ سے اک بات نبیؐ جی

رہتا ہوں شب و روز میں اک خوف کی زد میں
دھڑکا سا لگا رہتا ہے دن رات نبیؐ جی

چھٹتے ہی نہیں دل سے مرے درد کے بادل
رکتی ہی نہیں آنکھ کی برسات نبیؐ جی

کب تک ہمیں پسنا ہے یونہی غیر کے ہاتھوں
کب تک نہیں بدلیں گے یہ حالات نبیؐ جی

چالاک بہت ہیں تری امت کے یہ دشمن
کر جائیں نہ امت سے کوئی ہات نبیؐ جی

اکرم ناصر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اے زیبِ زین توسنِ زرّیں زمام! رُک
گھبرا کے چھپ نہ جائیں ستارہ سخن تمام

عقیدت

بھر دیجیے جھولی مری سرکارؐ مدینہ
مجھ پہ بھی برستے رہیں انوارِ مدینہ

مجھ عاصی پہ ہو نظرِ کرم آپؐ کی مولا!
مل جائیں مری سوچ کو افکارِ مدینہ

میں پاس رہوں روضۂ اقدس کے ہمیشہ
کُھل جائیں مری ذات پہ اسرارِ مدینہ

ہو ذکرِ نبی ہونٹوں پہ ، طیبہ کا تصوّر
آنکھوں میں بسا ہو مرے دربارِ مدینہ

آنکھوں کی بصارت ہو، بصیرت رہے قائم
قسمت میں مری لکھا ہو دیدارِ مدینہ

میں دشتِ نوردی سے نکل آیا ہوں کب سے
اب تو نظر آنے لگے آثارِ مدینہ!

دِل شدتِ دیدار سے بے چین ہے نیّر
بس اب تو بُلا لیجیے سرکارِ مدینہ

نیّر سرحدی

کربلا ہائے کربلا

جبر کے نیزوں پہ ممکن ہے اٹھا سکتے ہیں
سر کسی طور کہاں آپ جھکا سکتے ہیں

لشکرِ شام تو اصغر کو ابھی سمجھا نہیں
مسکرا کر تجھے مٹی میں ملا سکتے ہیں

سوچتا ہوں میں سر دشت حسین ابنِ علی
بوڑھے ہاتھوں سے جواں لاشہ اٹھا سکتے ہیں؟

آلِ اطہار سے ہلکا سا بھی ہے بغض اگر
یاد رکھ لیجیے سجدے بھی گنوا سکتے ہیں

سرخ سینے پہ مودت کے نشاں کھینچ رہے
ان عزاداروں کو پانی تو پلا سکتے ہیں

حلقِ شبیر پہ خنجر کو چلانے والو
سوچ لیتے کہ رسول اللہ بھی آ سکتے ہیں

تم نے ٹاپوں تلے کچلے ہیں وہ پاکیزہ بدن
فرش سے عرش کی جو راہ دکھا سکتے ہیں

ایسے تنہا نہ ہمیں چھوڑ کے جاؤ غازی
لوگ بدکار ہیں خیمے بھی جلا سکتے ہیں

ہم کسی طور کسی اور کے ہو سکتے نہیں
آپ چاہیں تو چراغوں کو بجھا سکتے ہیں

یہ نواسے ہیں محمد کے، علی کے بیٹے
درِ خیبر نہیں دنیا بھی اٹھا سکتے ہیں

اشکباری پہ اتر سکتا ہے دریائے فرات
علی اصغر ہیں جو صحرا کو رلا سکتے ہیں

یہ مودت کے نشاں حشر میں کام آئیں گے
میرے اعمال کہاں مجھکو بچا سکتے ہیں

جن پہ لکھا ہو حسین ابن علی تیرا نام
ایسے اشجار تو نوحے بھی سنا سکتے ہیں

جو مرض کوئی بدن میں نہیں رہنے دیتا
ایسے لنگر کو تو ہم چھین کے کھا سکتے ہیں

حکمِ شبیر نہیں ورنہ فرشتے دانش
سر کٹانے کے لیے دشت میں آ سکتے ہیں

دانش عزیز

عقیدت

ترے گھر حلیمہ یہ کون آرہے ہیں
فرشتے ترے گھر کو مہکا رہے ہیں

کبھی دیکھ لوں آقاؐ شہرِ مدینہ
جہاں ذرے سورج کو شرما رہے ہیں

دھنی ہیں مقدر کے وہ کس قدر جو
"دیارِ نبیؐ کی طرف جا رہے ہیں"

رہے ساتھ صدیقؓ و فاروقؓ ان کے
وہ پہلو میں اب بھی جلا پا رہے ہیں

ترے گھر میں وہ آمنہ نور اترا
کہ مستی میں کعبے کو وجد آرہے ہیں

بڑا منتظر ہوں کوئی کاش کہہ دے
چلو تجھ کو سرکارؐ بلوا رہے ہیں

ہے ممکن کہ آجائے ان کی سواری
فضاؤں کے آثار بتلا رہے ہیں

یہ لگتا ہے مدحت ہے مقبول میری
گھٹا نور کی ابر برسا رہے ہیں

یہ لگتا ہے ان کا کرم ہو گیا ہے
جو لب پر حروفِ ثنا آرہے ہیں

خطا پر خطا کر رہا ہوں مگر وہ
کرم پر کرم ہی کیے جارہے ہیں

جو تھے پست اوجِ ثریا پہ پہنچے
کرم یوں غلاموں پہ فرما رہے ہیں

یہ پہلے سے ہی ان کے در پر پڑا ہے
یہ دانش کو کیا لوگ سمجھا رہے ہیں

اعجاز دانش

لسانِ حرم

کرے نہ ذکر مدینے کا جو لسانِ حرم
نہ اس کے دل میں حلاوت نہ وہ زبانِ حرم

اسی کے "نعبد" "ایاك نستعین" کی لاج
کہ جو مدینہ میں ہے عبدِ مستعانِ حرم

تو اے مدینہ! انہیں بے نقاب پھر کردے
عقیدتوں کے لبادے میں منکرانِ حرم

جنھوں نے وار دیئے اپنے سر مدینے پر
وہی ہیں حق کی شہادت میں سورانِ حرم

وہ قوم طیبہ کہ "طُوبیٰ لَھُم وَ حُسنُ مَاٰب"
ہے جن کا دل مدنی ان کی جان جانِ حرم

زمیں پہ ہیں جو مواقیت وہ ہیں مکہ کے
مدینے کے لیے دل ہی سے ہے نشانِ حرم

مدینہ اس سے بھی آگے کی منزلوں کا سفر
روش بھلے ہو تمتع کہ حج قِرانِ حرم

مدینہ ہی اسے دیتا ہے ایسی تاب وتواں
ہے کوئی پیر تو وہ پھر سے ہو جوانِ حرم

یہ خط مدینے نے کھینچے حرام یا احرام
کہاں نہاں ہے تقدس کہاں عیانِ حرم

وہ "اِذھَبُوا" میں ہے اور اس پہ "اَنتُمُ الطُّلَقَاء"
کہ دے امان جو مدینہ وہی امانِ حرم

اذاں تھی کیا مدنی "لا الہ الا اللہ"
کہ جس کو سن کے گرے منہ کے بل بتانِ حرم

کہاں کوئی دل وجان چھوڑتا ہے خود اپنے
ہے یہ تو جلوہ مدینے کا دلستانِ حرم

ہو جس زباں کا مدینہ مدینہ ورد آصف!
وہی زبان ہے مدینہ وہی زبانِ حرم

مرزا آصف رسول

رُباعیات

گلزار بخاری

احباب کو معلوم ہے ماجوج نہیں
پنہاں یہ کسی سے نہیں یاجوج نہیں
خالق نے بچایا مجھے معذوری سے
فالج زدہ ہوں شکر مفلوج نہیں

.....

گل رنگ صراحی مری توڑی یا رب
تلخی کی طرف زندگی موڑی یا رب
مٹی میں ملائے مرب اسبابِ نشاط
خاکم بدہن حد نہیں چھوڑی یا رب

.....

کرتی ہے پریشاں بھی خلش راس بھی ہے
تنہائی میں یکجائی کا احساس بھی ہے
آنکھوں سے نہاں اور سکونت دِل میں
اک وقت میں تو دور بھی ہے پاس بھی ہے

.....

اے قلب نشیں خانہِ جاں ہے کِس کا
مسکن ہے ترا اور مکاں ہے کِس کا
دل توڑ نہ مرا کہ ہے مسکن ترا
اس گھر کے اُجڑنے میں زیاں ہے کس کا

ماہیے

اَب اُس کو تانگ نہیں
ورنہ سجنی کا
نمبر تو رانگ نہیں

سرما کی راتوں میں
آگ لگاتی ہے
وہ باتوں باتوں میں

ہیروں کی لڑی ہو گی
آخری ہیرے میں
مِری آنکھ جڑی ہو گی

سایہ پربت پر تھا
مَیں نے دیکھا وہ
بیٹھا ہُوا چھت پر تھا

ساون میں نہ بھادوں میں
ہم تو بھیگے ہیں
ساجن ! ترے وعدوں میں

رکھتے ہیں سالوں سے
خُوشبو آتی ہے
پھر بھی رُومالوں سے

کچھ ہے اِن چیزوں میں
وہ بھی رہتا ہے
پرچی ، تعویذوں میں

اَب قسمت باغوں کی
ہم نے بَو دی ہے
اِک فصل چراغوں کی

ہم عرضی نویس آئے
بیٹھو پہلو میں
تمہیں اُردو سلیس آئے

بادل کی یاری میں
آنسو ہی آنسو
دِل کی الماری میں

پتّھر ہے کہ موتی ہے
ہنستی نہ ہنساتی ہے

غم کے موسم میں
ساون کی رُت بھی

پہچان یہ ہوتی ہے
بس آگ لگاتی ہے

اِک مرحلہ آیا تھا
رستوں میں نہ کھو جانا

تعبیروں کو بھی
جو ہنس کر دیکھے

خوابوں نے بچایا تھا
بس اُس کے ہو جانا

سکّہ ہے کانسی کا
منکے لیے پھرتے ہو

خم نہ کرے جو سَر
پھر کیوں سانپوں کی

اُسے حکم ہے پھانسی کا
پھنکار سے ڈرتے ہو

آنسو کہہ جاتا ہے
دُکھ درد سناتا ہے

دِل میں اِک دریا
پھر آئینہ بھی

چلتا رہ جاتا ہے
چپ سا ہو جاتا ہے

سُوئی میں دھاگا ہے
اُس کے چھونے سے

اِک جذبہ جاگا ہے

بادل جو برستا ہے
صحرا سے آگے

شاید کوئی رستا ہے

خاور اعجاز

ہائیکوز

جلدی جانے والوں کی
عُجلت یہ بتلاتی ہے
کوئی تو رستہ دیکھے ہے

ہم جیسے دیوانے تو
خوابوں کے بازاروں میں
تیری خاطر جاتے ہیں

مولا! بے بس لوگوں کا
تیری فانی دنیا میں
جینا کتنا مشکل ہے؟

دنیا کے سرداروں نے
کوفہ کے بازاروں نے
ایسے قیدی دیکھے ہیں؟

عدل و انصاف کی مُنڈیروں پر
شان و شوکت سے گدھ بیٹھے ہیں
عام لوگوں کو نوچنے کے لیے

سارے مسند نشین ہوتے ہی
اُس خدائے اَحد کے بندوں سے
دو نوالے بھی چھین لیتے ہیں

دنیاداری کے اِن جھمیلوں میں
آپ جیسے حسین چہروں کو
لوگ اِک روز بھول جائیں گے

پُرسہ دیتا ہوں ایسے لوگوں کو
جن پہ مشکل مقام آئے تو
سارے احباب چھوڑ جاتے ہیں

طلحہ غفور

حفیظ تائب اصول نعت کا سنگِ میل

حفیظ تائب وہ نعت گو ہیں جن کے کلام نے نعت کو باقاعدہ ایک ادبی صنف کا درجہ دلایا۔ ان سے پہلے نعت کو عقیدے پر مبنی شاعری کے طور پر یا مذہبی موضوع کی شاعری تک محدود رکھا اور سمجھا جاتا تھا۔ جس طرح ان سے پہلے مذہبی موضوعات میں انیس نے مرثیے کو ایسی ہی رفعت عطا کی کہ اس کے بعد نہ صرف مرثیے کا ایک معیار طے کر دیا بلکہ مرثیے کی عظمت طے کر دی۔ انیس کے ہاں تشبیہات و استعارات کا وہ شکوہ نظر آتا ہے جو شاید ہی اردو کے کسی شاعر کو نصیب ہوا ہو۔

انیس کے بعد مذہبی یا عقیدے کی شاعری کو سرفرازی بخشنے کی دوسری مثال حفیظ تائب کی ہے۔ جس میں کچھ سنگ ہائے میل طے ہوتے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ عہد موجود میں کمرشلزم اور موقع پرستی کی وبا نے عشق، محبت اور عقیدت جیسے مقدس جذبات کو بھی مجروح کیا ہے لیکن حفیظ تائب جیسے صاحبانِ بصیرت اور مخلص تخلیق کار ادب کے گرد حفاظتی حصار بھی قائم کرتے نظر آتے ہیں۔

حفیظ تائب نے نعت کے جو معیارات سیٹ کیے ان میں پہلا معیار خلوص ہے، دوسرا احترام اور تیسرا عشق ہے۔ اگر ان تینوں میں سے کوئی ایک معیار یا اصول کمزور رہ جائے تو صنفِ نعت کا حق ادا نہیں ہو پاتا۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ہیئتی اعتبار سے نعت پر کوئی قید نہیں کہ وہ غزل کی فارم میں ہو یا نظم کی لیکن صنفی اعتبار میں فنی محاسن کے علاوہ اوپر بیان کیے گئے تین اصول یا پیمانے اس صنف کے درجے کے تعین میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ ایک بہت ہی باریک نکتہ جو میرے مشاہدے میں آیا کہ حمد و نعت اور مرثیہ و سلام میں تخاطب کے حوالے سے اکثر شعرا حمد لکھتے ہوئے ربِ ذوالجلال کے جب اس کے بندے کے طور پر بے تکلفی یا شکوے کا پہلو لے کے آتے ہیں تو یہ معیوب اور گراں نہیں گزرتا بلکہ خدا اور بندے کے درمیان رشتے کی مضبوطی کی گواہی نظر آتا ہے لیکن نعت ہو یا سلام نہ تو شکوہ کا محل ہے نہ بے تکلفی کی اجازت۔

فرحت عباس شاہ

حفیظ تائب کی نعت کو جب اس تناظر میں دیکھا جائے تو نہ صرف ہر معیار پہ پورا اترتی نظر آتی ہے بلکہ عمدہ و اعلیٰ مثال کے طور پر سامنے آتی ہے۔ حفیظ تائب نے خود اپنے کلام کے اندر نعت گوئی کے قواعد و ضوابط طے کر کے آنے والے زمانوں کے لیے اصولِ نعت وضع کر دیئے۔ درج ذیل نعت دیکھیے۔۔۔

نعت گوئی کے لیے حسن ارادت شرط ہے
ساتھ کچھ فہم کتاب و علم سیرت شرط ہے

اس میں بے لازم جمال فن بھی، اوج فکر بھی
جتنی ممکن ہو خیالوں کی طہارت شرط ہے

گر ادب پہلا قرینہ ہے ثنا کے شہر میں
ہر قدم اس راہ میں عجز طبیعت شرط ہے

اسوہ کا بھی نعت میں ابلاغ ہونا چاہیے
لیکن اس میں بھی لطافت اور حکمت شرط ہے

ہے محبت آپؐ کی ایمان کامل کی کلید
ہاں مگر جوش محبت میں اطاعت شرط ہے

ان کی تعلیمات میں مضمر ہے حسن زندگی
اُن سے بھرپور استفادہ بہرامت شرط ہے

سیرت پرنور تائب ہم کو دیتی ہے سبق
ہر قدم پر احترام آدمیت شرط ہے

.....

اگرچہ عشق کے معاملے میں انسان کے بے اختیار ہونے کے باعث شاعر کو رعایت مل سکتی ہے کیونکہ عاشق ہونا تو بہت ہی نصیب کی بات ہے کہ یہ درجہ کسی کو ملے یا نہ ملے لیکن نعت میں خلوص اور احترام پر کمپرومائز نہیں کیا جاسکتا۔ حفیظ تائب ان معدودے شعرا میں سے ہیں جنھیں یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ عشقِ رسولؐ سے سرشار شاعر ہیں۔ ان کی شخصیت کمال کی نرمی اور کوملتا سے بھری ہوئی تھی۔ گفتار کی حلاوت تو کیا ہاتھ کا لمس دل کو چھو لینے کی طاقت رکھتا تھا۔ عشقِ رسولؐ پاک کی روشنی ان کے چہرے سے مترشح تھا۔ یہی ادب آداب ان کی نعت کے خدوخال کو ترتیب دیتے ہیں۔

قدموں میں شہنشاہ دو عالم کے پڑا نہیں
میں ذرۂ ناچیز ہوں یا بختِ رسا ہوں

اب کون سی نعمت کی طلب حق سے کروں میں
دہلیز پہ سلطانِ مدینہ کی کھڑا نہیں

اس پیکرِ نُوریں کو تصور میں بسا کر
میں روضۂ اطہر کی طرف دیکھ رہا ہوں

دامن مرا دھلوایا گیا عرفہ میں پہلے
پھر درگہِ سرکار میں بلوایا گیا ہوں

اے کاش ذرا دیر یہیں وقت ٹھہر جائے
میں پیشِ رسول عربی نعت سرا ہوں

.....

اگرچہ حفیظ تائب نے بطور شاعر آغاز تو غزل سے کیا لیکن پھر نعت ہی ان کا اوڑھنا بچھونا رہی اور رب تعالیٰ نے اپنے محبوب کی ثنا کے صدقے ان کو جس عزت و توقیر سے نوازا وہ دائمی ہے کوئی ایک دو زمانوں کی بات نہیں۔

☆☆☆☆☆

عطاالحق قاسمی کے تخلیقی رنگ

پی ٹی وی کے ایم ڈی، ناروے میں پاکستان کے سرکاری سفیر، ادبی مجلّے معاصر کے مدیر اعلیٰ، چیئرمین الحمرا آرٹس کونسل، اردو ادب کے استادوں کے استاد عطاالحق قاسمی کے ادبی اور تخلیقی رنگ بلاشبہ ہم سب نے دیکھے ہیں۔ انہوں نے پاکستان ٹیلی ویژن اور پنجاب آرٹس کونسل کا قبلہ درست کرنے کیلئے جو حکمت عملی اپنائی، اس کے اثرات و ثمرات سے فن کار اور ان اداروں کے ملازمین بھی فیضیاب ہوتے رہے اور فنون و ثقافت کی ترویج و ترقی کے دروازے کھلتے چلے گئے۔

مزاح نگار، شاعر، دانشور، مدبر، مدیر، سفیر، سفرنامہ نگار، پروفیسر، ڈراما نویس اور بحر۔ ثقافت و سیاحت کے شناور عطاالحق قاسمی کی شگفتہ مزاجی، بذلہ سنجی، کالم نگاری، خوش لباسی، رجائیت پسندی، حُب الوطنی، انسان دوستی، خوش اخلاقی، جرأت و بے باکی، کشادہ دلی، خیر سگالی اور روشن خیالی کے کیا کہنے۔ دن رات صدقہ بانٹتے نظر آتے ہیں۔ یہ بات وثوق کے ساتھ اس لئے کہی جاسکتی ہے کہ آپ انہیں کہیں بھی مل لیں، ملاقات سرراہ ہو یا کسی محفل میں، آپ کو ان کے چہرے پر مسکراہٹ سجی نظر آئے گی۔ مسکرا کر ملتے ہیں، مسکرا کر بات کرتے ہیں، مسکرا کر خوش آمدید کہتے ہیں اور اگر مسکرا نہ رہے ہوں تو یقین کیجئے قہقہہ لگا رہے ہوتے ہیں اور ایسے وقت میں ان کا انگ انگ، آنکھیں، خدوخال سب قہقہہ زن محسوس ہوتے ہیں۔ جیتی جاگتی شخصیت ہیں۔ جس محفل میں چلے جائیں جان پڑ جاتی ہے، جہاں سے اُٹھ کر چلے جائیں، وہاں کی فضائیں دیر تک مسکراتی دکھائی دیتی ہیں۔ پریشانی میں حوصلہ بھی اپنے

ظفر معین بلے جعفری

مخصوص انداز میں بڑھاتے ہیں۔ روتوں کو ہنساتے ہیں اور پورے ماحول کو گدگداتے ہیں۔ یہ زندہ دلی زندہ دلانِ لاہور سے انہوں نے مستعار لی ہے یا زندہ دلانِ لاہور کو انہوں نے اُدھار دی ہے، یہ فیصلہ لاہوری ہی کر سکتے ہیں۔

عطاالحق قاسمی اردو اور پنجابی ادب کے رسیا ہیں اور ان دونوں مقبول زبانوں سے پیار کرنے والے ان سے بھی پیار کرتے ہیں۔ یہ پاکستانی ثقافت کے بھی دلدادہ ہیں اور پنجابی ثقافت کو پاکستانی ثقافت کے رنگا رنگ گلدستے کا ایک دلکش رنگ سمجھتے اور قرار دیتے ہیں۔ دنیا بھر میں انہیں پاکستان کی نمائندگی کا دو چار، دس، بیس بار نہیں سینکڑوں بار اعزاز حاصل ہو چکا ہے۔ عالمی مشاعرے، عالمی کانفرنسیں، عالمی سیمینار، عالمی مزاح کانفرنسیں یا کسی بھی عنوان کے تحت کسی بھی دیس میں اگر بڑے پیمانے پر کوئی کانفرنس یا محفل سجتی تو اس میں عطاالحق قاسمی، امجد اسلام امجد، خالد احمد اور دیگر قدآور ادیب یا شاعر پاکستان سے ضرور جاتے۔ وہاں جا کر سائیڈ پروگرام کے طور پر دنیا بھر سے آئے ہوئے اہلِ ادب سے ملاقاتیں اور کھل کھلا کر باتیں ہوتیں اور واپسی پر ہمارے عطاالحق قاسمی صاحب اپنے ساتھ اتنا مواد لے آتے کہ نئے غیر ملکی دورے پر روانہ ہونے تک ان کے لکھنے لکھانے خصوصاً روزن دیوار سے جھانکنے اور دیکھنے دکھانے کا عمل جاری رہتا۔ انہوں نے کسی پاکستانی شخصیت کیلئے ایک تیکھا جملہ اپنے کالم میں لکھا تھا کہ وہ آج کل مختصر دورے پر پاکستان آئے ہوئے ہیں۔

ہمارے عطا بھائی بھی جب مشاعروں اور عالمی ادبی کانفرنسوں کا دور جوبن پر تھا، تو بعض دنوں میں اتنے تسلسل اور تواتر کے ساتھ غیر ملکی دورے کرتے تھے کہ انہوں نے کئی ملکوں کو اپنے لاہور کی گلی بنا رکھا تھا۔ آج واپسی ہوئی اور اگلے دن پھر سمندر پار کسی دیس کیلئے روانگی۔ ایسے موسم میں، میں اس وقت بھی ان کے انداز میں یہ سوچتا تھا کہ آج کل یہ مختصر دورے پر پاکستان آئے ہوئے ہیں۔ ایک خاص بات جو میں نے ان میں دیکھی، وہ یہ بھی ہے کہ یہ سیماب صفت ہیں۔ کہیں ٹھہرتے نہیں، ٹک کر نہیں بیٹھتے۔ خود بھی سرگرم ہیں اور اپنے حلقۂ یاراں کو بھی متحرک اور سرگرم رکھتے ہیں۔ ہر شہر میں ان کا حلقۂ یاراں ہے۔ جہاں جائیں محفل سج جاتی ہے۔ کسی تقریب میں مدعو ہوں تو ان کا بے تابی کے ساتھ کیا جاتا ہے انتظار۔ جب یہ وہاں پہنچتے ہیں تو بکھرے نظر آتے ہیں رنگ بہار۔ چل پڑتا ہے گلشن کا کاروبار۔ اور جب کھلتے ہیں ان کے لبِ اظہار تو ماحول دکھائی دینے لگتا ہے شاندار۔ وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ شخصیت ہے بڑی باغ و بہار جہاں جہاں اردو بولی، پڑھی، لکھی اور سمجھی جاتی ہے،

وہاں وہاں ان کے نام، کلام اور کام کا چرچا ہے۔ شوقِ آوارگی ان کی ''پہلوٹھی'' کی خوبصورت کتاب ہی نہیں، آوارگی کا ذوق و شوق ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ان کے مزاح میں سنجیدگی اور ان کی سنجیدگی میں ظرافت قارئین اور سامعین کے دامانِ سماعت و بصارت کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ کئی دہائیوں پہلے کی بات مجھے یاد ہے محترم عطاالحق قاسمی صاحب کسی عالمی اردو مزاح کانفرنس میں شرکت کیلئے بھارت میں تھے۔ دوردرشن والوں یا کسی اور بھارتی ٹی وی چینل نے ان کا انٹرویو کیا اور ان سے سوال کیا آپ کے خیال میں اس عالمی اردو مزاح کانفرنس کے پاک بھارت تعلقات پر کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ جواباً محترم عطاالحق قاسمی صاحب نے صرف اتنا کہا کہ میرے خیال میں پاک بھارت تعلقات کو بہتر بنانے کیلئے عالمی مزاح کانفرنس کی نہیں، سنجیدہ کوششوں کی ضرورت ہے۔ اس پر محفل کشتِ زعفران بن گئی۔

عطا الحق قاسمی صاحب نے کالم نگاری کا آغاز روزنامہ نوائے وقت لاہور سے کیا۔ وہ روزنِ دیوار سے جو کچھ دیکھتے، اسے اپنے مخصوص پیرائے اور خوبصورت کالم کی شکل میں سب کو دکھا دیا کرتے تھے۔ ان کا انداز اپنا تھا اور آج بھی اپنا ہے۔ اسے کل بھی بڑا پسند بھی کیا جاتا تھا۔ اور آج بھی پسند کیا جاتا ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب 'نوائے وقت' میں کارکنوں کو تنخواہیں وقت پر نہیں ملا کرتی تھیں اور جب ملتی بھی تھیں تو آسان قسطوں میں۔ یہ صورت حال ملازمین اور کارکنوں کیلئے بڑی پریشانی کا باعث تھی، وہ یہ شکایت زبان پر اس لئے نہیں لاتے تھے کیونکہ انہیں ڈر تھا کہ اگر خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی ہو گیا تو انہیں ملازمت سے فارغ کر دیا جائے گا۔ ان حالات میں محترم عطاالحق قاسمی صاحب بھی مایوس نہیں ہوئے اور شعری پیرائے میں اپنے دکھ بیان کر کے دل کا بوجھ ہلکا کرتے رہے۔ مگر یہ ''مخصوص شاعری'' ان کے دوستوں، اہلِ ادب اور 'نوائے وقت' کے ملازمین تک ہی پہنچتی رہی۔ پھر ان پر شوق آوارگی کا جنون سوار ہوا تو انہوں نے سیر سپاٹے کا پروگرام بنا لیا اور امریکا کیلئے رختِ سفر باندھا۔ ان کے بہت سے ساتھی نہیں چاہتے تھے کہ یہ سمندر پار جائیں، اس لئے نہیں کہ وہ انہیں اونچی اڑان بھرتا نہیں دیکھنا چاہتے تھے بلکہ اس لئے کہ وہ مشکل حالات میں اپنی شگفتہ مزاجی اور بذلہ سنجی سے سب دوستوں کی پریشانیوں کو ہوا میں اڑا دیا کرتے تھے۔ لوگ سوچتے تھے اگر وہ بھی چلے گئے تو مشکلات میں جینا آسان نہیں رہے گا۔ بہرحال انہیں جانا تھا تو ان کے اعزاز میں دوست احباب نے 'نوائے وقت' کی دفتری حدود ہی میں ان کیلئے ایک الوداعی تقریب سجا لی۔ ان دنوں مجید نظامی

صاحب اور کارکنوں کے درمیان زیادہ فاصلے نہیں تھے۔ فیصلہ کیا گیا کہ مجید نظامی صاحب کو بھی بلا لیا جائے۔ چنانچہ انہیں بھی دعوت دے دی گئی، وہ آئے تو ان کے آنے کے بعد بھی عطاالحق قاسمی صاحب کی بذلہ سنجی اور شگفتہ مزاجی کے رنگ فضاؤں میں بکھرتے رہے۔ کسی دوست نے شرارتاً فرمائش کر دی کہ 'نوائے وقت' کے حوالے سے آپ نے اقبال کے کلام میں جو تضمین کی ہے، وہ سنائیں۔ عطاالحق قاسمی صاحب نے ٹال دیا اور جب مجید نظامی صاحب نے کہا، ضرور، ضرور، آپ سنائیں۔ عطاالحق قاسمی صاحب نے کہا ہم جب ماہانہ تنخواہ لینے کیلئے اکاؤنٹینٹ کے پاس جاتے ہیں تو وہ کبھی پوری تنخواہ یکمشت نہیں دیتے بلکہ جو کچھ کہتے ہیں، وہ بتائے دیتا ہوں اور یہ کہہ کر انہوں نے ایک شعر شرکائے محفل کی نذر کیا۔ آپ بھی سُن لیں۔

بنتے ہیں تیرے چار سو، فی الحال چار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ

.....

یہ کلام سن کر مجید نظامی صاحب بھی بظاہر بڑے محظوظ ہوئے۔ آپ دیکھئے کہ اس شعر میں بھی عطاالحق قاسمی صاحب کی رجائیت پسندی بولتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔

اس محفل میں شرکت کے بعد عطاالحق قاسمی صاحب کی زندگی میں ایک نیا موڑ آ گیا۔ وہ سمندر پار چلے گئے اور وہاں جا کر سیر سپاٹوں کے ساتھ انہوں نے سفرنامہ نگاری شروع کر دی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے احمد ندیم قاسمی صاحب نے اس سفرنامے کو فنون کے صفحات کی زینت بنایا۔ فنون میں یہ سفرنامہ قسطوں میں اہتمام کے ساتھ شائع کیا جاتا رہا۔ اس وقت 'فنون'، 'سیپ'، 'اوراق'، 'نقوش'، 'چٹان'، 'ادبِ لطیف'، 'محفل'، 'افکار' اور ایسے کئی جرائد تھے، جو بھارت کے شہر شہر میں بھی مقبول تھے۔ اس لئے عطاالحق قاسمی صاحب کی شہرت کو بھی چار چاند لگتے چلے گئے۔ مجھے یاد ہے میرے بڑے بھائی سید عارف معین بلے کو ایک بڑی کامیابی پر میرے والد بزرگوار سید فخرالدین بلے نے جو کتاب بطور انعام یا تحفتاً دی تھی، وہ شوق آوارگی ہی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ اس میں ایک باب ایسا بھی ہے کہ پتھر دل بھی پڑھ لے تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ پھوٹ پڑے گا۔ اور پھر واقعی ایسا ہی ہوا۔ اولڈ پیپلز ہوم پڑھ کر عارف بھائی مجھے اپنے آنسو بار بار رومال سے خشک کرتے نظر آئے۔ اور جب ابو دفتر سے آئے تو انہوں نے کہا واقعی آپ نے صحیح فرمایا تھا۔ اولڈ پیپلز ہوم نے تو مجھے رُلا کر رکھ دیا۔

عطاالحق قاسمی صاحب نے انشائیے تو نہیں لکھے لیکن جو۔ عطائیے۔ لکھے ہیں، وہ انشائی رنگوں سے بھرپور ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی دونوں اردو ادب کے دو

مختلف مکاتبِ فکر سے وابستہ تھے اور ان دونوں مکاتبِ فکر نے انشائیہ نگاری کی جو تعریف کی ہے، وہ ایک دوسرے سے بڑی مختلف ہے۔ اس حقیقت کے اعتراف کے ساتھ میں سمجھتا ہوں کہ ان دونوں مکاتبِ فکر سے وابستہ دو شخصیات ایسی ہیں، جن کی گفتگو ہی انشائیے سے کم نہیں۔ یا یوں کہیے کہ اگر کوئی یہ پوچھے کہ انشائیہ کیا ہوتا ہے تو انشائیے کی خوبیاں اور اس کے خدوخال اجاگر کرنے کے بجائے یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اگر آپ نے سرگودھا شہر کے ادیب، شاعر اور نقاد پروفیسر غلام جیلانی اصغر اور ہمارے محترم عطاالحق قاسمی کی گفتگو سنی ہو تو بس اتنا جان لیں کہ یہی انشائیہ ہے۔ بلکہ بولتا ہوا انشائیہ ہے۔ اب اگر آپ نے کبھی انھیں نہیں سنا تو ان کے کالم پڑھ لیں، عطائیے پڑھ لیں، روزنِ دیوار سے عطاالحق قاسمی صاحب کی مزاحیہ، طنزیہ، شگفتہ اور شائستہ تحریروں کو پڑھ لیں، آپ کو پتا چل جائے گا کہ انشائیہ کیا ہوتا ہے۔ پروفیسر غلام جیلانی اصغر تو باقاعدہ انشائیہ نگار تھے اور انشائیے لکھ کر انھوں نے ادبی مجلے اوراق کے ساتھ ساتھ دنیائے ادب میں دھوم مچائے رکھی۔ 'فنون'، 'جنگ' اور 'نوائے وقت' میں اپنے یہی تخلیقی رنگ عطاالحق قاسمی صاحب نے دکھائے اور خود کو بطور انشائیہ نگار متعارف کرانے سے گریزاں رہے۔ انشائیے لکھے ضرور رہے۔ اور کالموں یا دیگر شگفتہ نگارشات کی صورت میں انھیں منظرِ عام پر لاتے بھی رہے۔ میرے اس موقف کی تائید کے لئے۔ خندِ مکرر، کالم تمام، آپ بھی شرمسار ہو، ڈھول ڈھپا، سرگوشیاں، جرمِ ضعیفی کافی ہیں۔ بازیچۂ اطفال، عجیب معقول، بارہ سنگھے، مزید گنجے فرشتے، ہنسنا رونا منع ہے، علی بابا چالیس چور اور اپنے پرائے بھی ان کی ایسی شاندار کتابیں ہیں، جن میں آپ کو ان کی شخصیت کے بہت سے دلکش رنگ نظر آئیں گے۔

عطاالحق قاسمی صاحب کی جرأت و بے باکی کے نقوش میرے دل و دماغ میں محفوظ ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ صدر ضیاالحق کے دور میں ایک حاضر سروس جنرل کا شعری مجموعہ منظرِ عام پر آیا تو اس کی تقریبِ رونمائی میں انھیں بھی اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی۔ یہ اُس دور کی بات ہے جب نوے دن کے لیے اقتدار میں آنے والے ضیاالحق انتخابات کرانے سے کنی کترا رہے تھے۔ انکاری تو نہیں تھے لیکن اقتدار چھوڑنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ اس آمرانہ دور میں کسی لگی لپٹی کے بغیر میرے محترم عطاالحق قاسمی صاحب نے حاضر سروس جنرل کے ایم عارف کے شعری مجموعے کے حوالے سے کہا یہ کتاب میں نے پڑھی اور اس میں سے کوئی شعر منتخب نہیں کر پایا تو مجھے احساس ہوا کہ واقعی "انتخاب" کرنا اور کرانا آسان کام نہیں۔ یہ جرأت اور بے باکی بلاشبہ

انھی کا خاصا ہے۔

عطاالحق قاسمی صاحب کے کچھ اشعار ضرب المثل بن چکے ہیں۔ یہ خوبی بہت کم شعرا کے نصیب میں آئی ہے۔ عصر حاضر ہی کے ایک اور شاعر ہیں شعیب بن عزیز۔ ان کا ایک شعر بھی ایسا ہے جو موقع محل کی مناسبت سے بڑی بڑی ہستیوں کی زبان پر ہوتا ہے۔ آصف علی زرداری صاحب سے بھی کئی محفلوں میں ان کا یہ شعر سنا گیا۔ شعر یہ ہے:

اب اُداس پھرتے ہو سردیوں کی شاموں میں
اس طرح تو ہوتا ہے، اس طرح کے کاموں میں

.....

بات ہو رہی ہے محترم عطاالحق قاسمی صاحب کے ضرب المثل اشعار کے حوالے سے اور ان کے دوست شعیب بن عزیز صاحب تک پہنچ گئی۔ کیوں؟ محض اس لئے کہ

اس طرح تو ہوتا ہے، اس طرح کے کاموں میں

.....

وزیراعظم شہباز شریف تو اکثر محفلوں میں موقع محل کی مناسبت سے اشعار پڑھتے ہیں اور دنیا نے ٹی وی پر ان سے مختلف مواقع پر عطاالحق قاسمی صاحب کا کلام سنا ہے۔ ان کی ایک غزل تو وہ اکثر محفلوں میں سنا کر مجمع سے داد و تحسین سمیٹتے ہیں۔ اور بعض اوقات تو بڑا زور دے کر یا گنگنا کر بھی وہ یہ شعر پڑھتے یا پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ پوری غزل ہی بڑی مرصع ہے اور ہمارے معاشرے میں جو ظلم کا بازار گرم ہے اور اس کے باوجود انصاف نہیں ملتا، اس کی جھلک اس کے آئینے میں دیکھی جا سکتی ہے۔ آپ کی یادداشت کو تازہ کرنے کیلئے یہ غزل پیشِ خدمت ہے۔ بلاشبہ زبان سادہ اور بیان بڑا اثر انگیز اور دل میں اتر جانے والا ہے۔ آپ پہلے عطاالحق قاسمی صاحب کی یہ غزل ملاحظہ کیجئے۔ پھر اس کے بعد وزیر اعظم شہباز شریف سے ایک درخواست بھی کرنی ہے:

خوشبوؤں کا اک نگر آباد ہونا چاہیے
اس نظامِ زر کو اب برباد ہونا چاہیے

ان اندھیروں میں بھی منزل تک پہنچ سکتے ہیں ہم
جگنوؤں کو راستہ تو یاد ہونا چاہیے

خواہشوں کو خوبصورت شکل دینے کے لئے
خواہشوں کی قید سے آزاد ہونا چاہیے

ظلم بچے جن رہا ہے کوچہ و بازار میں
عدل کو بھی صاحبِ اولاد ہونا چاہیے

.....

وزیراعظم شہباز شریف سے گزارش صرف اتنی سی ہے کہ آپ صرف اسی غزل پر اکتفا نہ کریں، آپ کو عطاالحق قاسمی صاحب کے کلام میں سے بہت سی ایسی جاندار غزلیں مل سکتی ہیں، جن میں آپ کو اور شرکائے محفل کو عوام کے دلوں کی دھڑکنیں بھی سنائی دیں گی۔ اس لیے امید ہے کہ وہ آئندہ ان

کی دیگر غزلوں کو بھی پیش کر کے داد و تحسین سمیٹنے کی کوشش ضرور کریں گے۔

انسان اپنی صحبت سے بھی پہچانا جاتا ہے۔ عطا بھائی کے قریبی دوستوں میں بہت سی ادبی شخصیات کے ساتھ ساتھ امجد اسلام امجد، اجمل نیازی اور محترم خالد احمد تین ایسے نام ہیں، جنہیں ہدفِ محبت بنانے سے وہ نہیں چوکتے تھے۔ سفر اور حضر میں بھی اکثر یہ احباب ان کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ لوگ کہتے تھے ایسا لگتا ہے کہ ان کے بغیر عطا بھائی کی روٹی ہضم نہیں ہوتی۔ خالد احمد کی کتاب ایک مٹھی ہوا کا فلیپ بھی عطاالحق قاسمی صاحب نے لکھا اور اپنے مخصوص انداز میں ان کی شخصیت کے تمام رنگوں کا بڑی خوبصورتی اور استادانہ چابکدستی کے ساتھ احاطہ کرلیا۔ اب آپ ملاحظہ فرمایئے، محترم خالد احمد کی کتاب ایک مٹھی ہوا، کے ٹائٹل کی پشت پر سجا عطاالحق قاسمی صاحب کا فلیپ۔

مجھے علم نہیں کہ خالد احمد کو اپنی کون سی حیثیت زیادہ پسند ہے۔ وہ غزل گو شاعر ہے، انوکھی نظمیں لکھتا ہے، مداح خوان رسول صل اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے، تنقید میں کسی کو گراتا اور کسی کو اٹھاتا ہے، دنیا بھر کے بچوں سے والہانہ محبت کرتا ہے۔ اس میں از راہِ لطف و عنایت اس نے اپنے بچے بھی شامل کر لیے ہیں۔ کچھ بڑوں کی عزت کرتا ہے اور جب وہ سیکھ جاتے ہیں تو انہیں نوندریں مارنے لگتا ہے۔ جلوے میں قہقہے لگاتا اور خلوت میں آنسو بہاتا ہے، جو کماتا ہے گھر سے دفتر جاتے ہوئے مستحقین میں تقسیم کر دیتا ہے، رات گئے تک جاگتا ہے اور دوپہر تک سوتا ہے۔ جھوٹ بولتا ہے، ایسے جھوٹ بھی جو سچ سے افضل ہوتے ہیں۔ وہ نارمل نہیں اور اس کی شاعری بھی نارمل شاعری کے ذیل میں نہیں آتی۔ ٹیڑھے مڑے رستوں پر چلنے والے خالد احمد کی شاعری ہمیں کم آمیز مناظر کی طرف لے جاتی ہے۔ کم آمیز مناظر، بے چین اور مضطرب لوگوں پر کھلتے ہیں۔ ان پر موجود سے مطمئن نہیں ہیں اور تلاش کے عمل میں ہیں۔ صبح سے شام تک تلاش میں نکلنے والے خالد احمد کی شاعری زمانے سے الگ، ممتاز اور دلکش ہے، بالکل اس طرح جس طرح خالد احمد بھری محفل میں سب سے الگ، ممتاز اور دلکش نظر آتا ہے۔ میں نہیں جانتا اسے اپنی کون سی حیثیت زیادہ پسند ہے۔ مجھے تو سارے کا سارا خالد احمد اچھا لگتا ہے اور اس کی ساری کی ساری شاعری میرے اندر ہلچل پیدا کرتی ہے۔

پاکستان ٹیلی وژن لاہور سینٹر اور ڈائریکٹر جنرل پبلک ریلیشنز آفس کے بالمقابل اعلیٰ معیار کی پرنٹنگ کا مرکز ٹریک اینڈ ٹائی بھی تھا۔ ہائی نون لیبارٹریز سے وابستگی کے باعث ہفتہ بھر میں چار، پانچ وزٹ تو میرے لازمی ہوتے تھے۔ ٹریک اینڈ ٹائی میں ہماری جناب عمران منظور صاحب اور اسد صاحب سے

ملاقات ہوا کرتی تھی، گپ، شپ، چائے اور بعض اوقات تو عمران منظور صاحب کے اصرار پر (اگر ہم لنچ کے ٹائم پر وارد ہوتے تھے) تو جوائن کرنا پڑتا تھا۔ وہاں کبھی کبھار برادر محترم جناب خالد احمد صاحب سے بھی ملاقات ہوتی تھی۔ بلکہ ایسا بھی ہوا کہ عطا بھائی، برادر محترم خالد احمد اور میں نے کہیں نہ کہیں بیٹھ کر چائے بھی پی اور گپ شپ بھی کی۔ ایک روز جب ہم وہاں پر پہنچے تو جناب عمران منظور صاحب نے کہا کہ آج آپ نہیں، میں بات شروع کروں گا اور یہ کہہ کر انہوں نے بتایا کہ خالد احمد بھائی نے آپ کے لیے اپنا شعری مجموعہ 'ایک مٹھی ہوا' بھجوایا ہے اور اس پر ان کا آٹو گراف بھی ہے۔ ہم نے بصد احترام جناب خالد احمد صاحب کی کرم فرمائی کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد سے عمران منظور صاحب کو بھی ہمارے اور خالد احمد بھائی کے مراسم اور روابط کا کچھ اندازہ ہوتا چلا گیا۔

بات ہو رہی ہے برادر محترم خالد احمد اور عطاالحق قاسمی کی اور ذرا دور نکل گئی۔ ان دونوں میں ایک قدر مشترک یہ بھی ہے کہ ان دونوں کی ولادت قیام پاکستان سے چار برس پہلے یعنی انیس سو تینتالیس میں ہوئی لیکن ہمارے عطا بھائی، جناب خالد احمد سے عمر میں چار ماہ اور چار دن بڑے ہیں۔ عطاالحق قاسمی صاحب یکم فروری 1943 کو اور نامور شاعر خالد احمد 5 جون 1943 کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ دونوں نے اپنے بزرگوں کے ساتھ ہجرت کر کے لاہور میں ڈیرہ ڈال لیا۔ برسوں پہلے کی بات ہے کہ برادر محترم خالد احمد کے اعزاز میں ایک پر وقار تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ اعلیٰ پائے کے مضامین پڑھے گئے تھے لیکن عطاالحق قاسمی صاحب کا مضمون بہت پسند کیا گیا تھا۔ بطور نمونہ ان کا ابتدائی جملہ اور اختتامی سطور حاضر خدمت ہیں۔

خالد احمد کے ساتھ میری دوستی جتنی پرانی ہے، اتنی پرانی تو کسی کے ساتھ دشمنی بھی نہیں ہوتی۔

اب ملاحظہ کیجئے عطاالحق قاسمی صاحب کے مضمون کے اختتامی کلمات۔

''مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ خالد احمد کے بارے میں زیادہ جاننے کا دعویٰ کرنا، خود کو اور دوسروں کو دھوکے میں مبتلا کرنا ہے۔ بچپن سے باپ کی شفقت سے محروم ہو جانے کے بعد سرد و گرم زمانہ چکھتے چکھتے خالد احمد نے اپنی ذات میں پناہ لے لی ہے۔ داتا گنج بخش کا قول ہے کہ اے انسان تیرا خود کو پہچاننا، خود کو ہلاکت میں ڈالنا ہے لیکن خالد احمد کے حوالے سے یہ بات اس طرح کہی جا سکتی ہے کہ اے انسان تیرا خالد احمد کو پہچاننا خود کو مزید ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ چنانچہ مجھے خالد احمد کو پہچاننے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنے دکھ تھوڑے ہیں کہ اب خالد احمد کے دکھوں کی چتا میں بھی خود کو جلایا جائے''۔

میں نے محترم عطاالحق قاسمی صاحب کی شخصیت، فن، خدمات اور ان کے شعروسخن پر قلم اٹھانے کا فیصلہ کیا تو یکلخت یادوں کی کھڑکیاں کھل گئی ہیں۔ یہ بات بھی بتادوں کہ وہ میرے والدِ بزرگوار ادیب، شاعر، دانشور، ماہر تعلقاتِ عامہ اور ڈیڑھ سو سے زیادہ مطبوعات کے مولف سید فخرالدین بلے کے تین چار پسندیدہ ترین کالم نگاروں کی فہرست میں سے ایک ہیں۔ اور ان کا کالم پڑھنے کے بعد وہ اس میں بین السطور جو کچھ لکھا گیا ہوتا تھا، کبھی کبھار اس کی نشان دہی بھی کر دیا کرتے تھے۔ اور اگر کالم چھپا ہوا اور وہ عدیم الفرصتی کی بنا پر نہ پڑھ پاتے تو ایک کمی سی محسوس ضرور کرتے تھے اور اس کا اظہار کر کے اپنا غم غلط کرنے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ وہ ان کے فن وسخن سے بھی پیار کرتے تھے اور اسی لئے ان کی محبت مجھے ہی نہیں ہماری فیملی کو ورثے میں ملی ہے۔ ان سے ملنے ملانے کے حوالے سے میرے بہن بھائیوں کی بہت سی یادیں مشترک ہیں۔ اور کچھ یادیں قافلے کے پڑاؤ کے حوالے سے ہیں۔

دراصل میرے والد بزرگوار ادب وثقافت کے دلدادہ تھے اور محفلیں سجانے کے شوقین بھی۔ اسی لئے میری آنکھ ایسے ماحول میں کھلی کہ گھر میں ادیبوں، شاعروں، دانشوروں، ذاکروں، فن کاروں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ اشفاق احمد، بانو قدسیہ، فیض احمد فیض، جوش ملیح آبادی، جون ایلیا، قتیل شفائی، مرتضیٰ برلاس، طفیل ہوشیار پوری، اداکار محمد علی، اداکار منور سعید، محسن بھوپالی، ڈاکٹر وزیر آغا، مصور اور سفرنامہ نگار اسلم کمال، صادقین، پروفیسر عاصی کرنالی، عرش صدیقی، اصغر ندیم سید، مسعود اشعر، انور سدید اور اسی پائے کی علمی ادبی شخصیات ہمارے گھر میں سجنے والی محفلوں کی رونقیں دوبالا کیئے رکھتی تھیں۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ 1980 انیس سو اسی کی دہائی میں انہوں نے ایک ادبی اور ثقافتی تنظیم قافلہ ہی بنالی، تاکہ زندگی کی ہنگامہ خیزیوں کے ساتھ قافلہ تنظیم کے تحت ماہانہ بنیاد پر نشست کا اہتمام مستقل بنیادوں پر جاری رکھا جاسکے اور یہ سلسلہ دس برس سے زیادہ جی۔ او آر تھری شادمان لاہور میں جاری رہا بھی۔ قافلے کے تحت سجنے والی محفلوں کو انہوں نے پڑاؤ کا نام دیا۔ اس قافلے کے پڑاؤ بڑی باقاعدگی کے ساتھ جی او آر تھری شادمان لاہور میں ہوا کرتے تھے اور جب اقامت گاہ بدل گئی تو یہ سلسلہ فیصح روڈ پر برسوں جاری رہا۔ قافلے کے بہت سے پڑاؤ میں محترم عطاالحق قاسمی صاحب نے شرکت کی۔ بڑے بڑے ادیب، شاعر اور دانشور اس محفل میں شریک ہوکر اپنا رنگ جماتے اور دکھاتے تھے۔ اس محفل کے حوالے سے اسرار زیدی کی رپورٹیں اخبار جہاں میں چھپا کرتی تھیں۔ بیدار

سرمدی اور سرفراز سید بھی اپنے کالموں میں اس کے رنگ دکھاتے تھے۔ اخبار خواتین میں بھی تفصیلی رپورٹیں شائع ہوتی تھیں۔ یہی نہیں ہفت روزہ آوازِ جرس لاہور کے بانی مدیر اعلیٰ میرے والد بزرگوار ہی تھے۔ اور اس کی ادارت کی ذمہ داریاں انہوں نے میرے ناتواں کندھوں پر ڈال دی تھیں۔ قافلے کے پڑاؤ کے حوالے سے بعد میں باتیں ہوں گی۔ پہلے بات ہو جائے اس یادگار مکالمے کی جو میں نے کیا۔ دراصل میں نے ہفت روزہ آوازِ جرس کا ایک خصوصی گوشہ محترم عطاالحق قاسمی صاحب کی شخصیت اور فن کے حوالے سے شائع کرنیکا ارادہ کیا۔ ہفت روزہ آوازِ جرس میں خصوصی گوشے شائع کرنے کے لیے بطور خاص اسکیچ بنوانے کی روایت بھی قائم کی گئی تھی۔ اس روایت کی پاسداری بھی تو ہم ہی نے کرنی تھی۔ خصوصی گوشے کیلئے میں نے محترم عطاالحق قاسمی صاحب کو فون کیا اور عرض کیا آپ سے ملنے کے لیے آنا چاہتا ہوں۔ ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ ٹی وی اینکر کی طرح عطاالحق قاسمی صاحب نے ہماری بات کاٹتے ہوئے فرمایا آپ کو بتانے۔ پوچھنے یا اجازت لینے کی ضرورت کب سے ہوگئی۔ ہم نے مؤدبانہ انداز میں عرض کیا جس وقت آپ کی گھر میں موجودگی یقینی ہو، وہ وقت بتا دیجے۔ ہم حاضر ہو جائیں گے کیونکہ ہمارے ارادے کچھ نیک نہیں ہیں۔ عطاالحق قاسمی صاحب اپنے مخصوص انداز میں ہنسے اور فرمایا دھمکی آمیز لہجہ ہے آپ کا، لیکن ہم واقف ہیں سید فخرالدین بلے صاحب اور ان کے خانوادے سے۔ ہم جانتے ہیں انہوں نے کن خطوط پر اپنے بچوں کی تربیت فرمائی ہے۔ ظفر بیٹا، آپ کل شام سات بجے کے بعد سے رات ایک بجے تک کسی بھی وقت تشریف لائیے بلکہ ہماری خوشی تو اس میں ہوگی کہ آپ ہمارے ساتھ ہی کھانا بھی کھائیں۔ ہم نے نہایت عاجزی سے گزارش کی آپ کھانے کا تکلف نہ فرمائیے۔ البتہ ہم چائے ضرور پئیں گے۔ عطا صاحب نے اس کے جواب میں بس یہی فرمایا کہ پہلی مرتبہ سن رہا ہوں کہ کوئی اپنے گھر میں بھی پوچھ کر آتا ہے اور تکلف کرتا ہے۔ ٹھیک ہے طے ہوگیا، کل شام سات بجے ملتے ہیں۔ اگلے روز ہم وقتِ مقررہ پر عطاالحق قاسمی صاحب کے دولت خانے پر پہنچے۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ عطا صاحب ہمارے منتظر تھے۔ کم و بیش ڈھائی تین گھنٹے ہمارا ان کے دولت کدے پر قیام رہا اور اس دوران زبردست اور ذائقہ دار چائے کے ساتھ لذیز اور ہماری من پسند چیزوں سے تواضع کی گئی۔ ہم نے ان کا انٹرویو لیا۔ کھل کر باتیں ہوئیں۔ ان کا کلام بھی سنا اور انٹرویو سے ہٹ کر تنے ادبی رجحانات پر بھی ان کے خیالات اور

تاثرات سے آگاہی سمیٹی۔ قصہ مختصر پھر جب ہم نے اجازت چاہی تو عطاالحق قاسمی صاحب نے اجازت تو دیدی لیکن خوش دلی سے نہیں، ان کی خواہش تھی کہ جس ماحول اور انداز میں مکالمہ جاری ہے، وہ جاری ہی رہتا اور بیشک خواہش تو ہماری بھی یہی تھی لیکن ہماری مجبوری یہ تھی کہ والدگرامی کو ماہر امراض قلب ڈاکٹر کمال کے پاس لے جانا تھا۔ بالکل رخصت ہوتے ہوئے ہم دروازے سے لوٹ کر واپس ان کے ڈرائنگ روم میں آ گئے اور ڈرائنگ روم کی دیوار پر آویزاں عطاالحق قاسمی صاحب کی بڑی سی تصویر اتار لی اور نہایت احتیاط سے بغل میں داب کر عرض کیا اس وقت تو بس یہ ڈکیتی کرنی تھی۔ پھر ہم نے آوازِ جرس کے مصور جناب طاہر نقوی کے سر پر سوار رہ کر غالباً سات دنوں میں اس۔ مقبوضہ تصویر۔ سے ایک اسکیچ تیار کروایا اور عطاالحق قاسمی صاحب کے گھر جا کر ان کی فریم شدہ تصویر انہیں لوٹا دی۔ پھر اگلے ہی ہفتے ہم نے عطاالحق قاسمی صاحب کے حوالے سے ہفت روزہ آوازِ جرس لاہور میں خصوصی گوشہ شائع کیا۔ جس میں عطاالحق قاسمی صاحب کے فن اور شخصیت کے حوالے سے بہت سا مواد اور تصاویر بھی شامل تھیں اور اس گوشے میں یہ اسکیچ بھی شائع کیا تھا اور اس اسکیچ کے ساتھ قاسمی اور قاسمی بھی۔ قارئین آوازِ جرس اور عطاالحق قاسمی صاحب نے اس خصوصی گوشے کو بہت پسند فرمایا۔ چند روز بعد ہم نے یہ اسکیچ بھی فریم کروا کر عطا صاحب کو بطور تحفہ پیش کیا اور اس کے ساتھ اسی اسکیچ کا ایک چھوٹا سا پازیٹو بھی بنوا کر انہیں پیش کیا اور عرض کیا جناب عطاالحق قاسمی صاحب یہ پازیٹو اس لیے کہ یہ آپ کے کالم کے مونوگرام میں استعمال ہو۔ اور پھر اگلے ہفتے سے ہی یہ اسکیچ ان کے کالم کے مونوگرام میں انگوٹھی میں نگینے کی طرح سے سجا دیا گیا اور پھر اسی اسکیچ والا مونوگرام برسوں۔ روزنِ دیوار سے۔ کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔

ہمارے گھر قافلے کے ماہانہ پڑاؤ میں عطاالحق قاسمی صاحب کے جگری یار بھی بڑی باقاعدگی کے ساتھ آتے تھے۔ ان میں خالد احمد، امجد اسلام امجد اور ڈاکٹر اجمل نیازی شامل ہیں۔ ڈاکٹر اجمل نیازی سے عطاالحق قاسمی کی قرابت داری اور دوستی کے بہت سے قصے مشہور ہیں لیکن بیگم عطاالحق قاسمی اور بیگم رفعت اجمل نیازی آپس میں دوپٹہ بدل بہنیں بھی ہیں۔ اس حوالے سے بھی عطاالحق قاسمی نے تعلق داری کے ہر تقاضے کو فرض بھی سمجھا اور قرض بھی۔ ڈاکٹر اجمل نیازی دنیا سے کوچ کر گئے تو اہلِ ادب نے انہیں بڑا دکھی دیکھا۔ ان کی یاد میں آنسوؤں کو قلم میں ڈبو کر انہوں نے کالم بھی لکھے اور اپنی یادوں کو تازہ بھی کیا۔

میں لکھنے بیٹھا ہوں تو بہت سے بیتے ہوئے منظر آنکھوں کے سامنے گھوم رہے ہیں۔ مال

روڈ پر ایک اعلیٰ معیار کا الائیڈ پرنٹنگ پریس تھا۔ وہاں جناب حسنین الملکی اور جناب جواد الملکی صاحب ہوا کرتے تھے۔ میرا اور عطا الحق قاسمی صاحب کا وہاں عموماً آنا جانا رہتا تھا۔ عطاالحق قاسمی کا مہینے میں الائیڈ پریس کا ایک وزٹ تو ضرور ہی ہوتا تھا۔ الائیڈ پریس کے مالکان ایک علمی اور ادبی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ حسنین الملکی اور جواد الملکی کے بڑے بھائی کا ایک ادبی رسالہ نرگس بھی تھا۔ عطاالحق قاسمی کے اور میرے ستارے ہمیشہ سے ہی ملتے ہیں، اگر سال شمار نہ کیے جائیں تو اس حساب سے عطاالحق قاسمی مجھ سے دس روز بڑے ہیں کیونکہ ان کا یوم ولادت یکم فروری اور میرا یوم پیدائش گیارہ فروری ہے۔ جبکہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی اور میری تاریخ ولادت ایک ہی ہے۔

عطاالحق قاسمی کا حلقۂ احباب بہت وسیع رہا ہے اور ان کے بے تکلفانہ مزاج کے باعث قربتیں اور محبتیں پنپتی ہی رہی ہیں لیکن حفیظ تائب، اختر حسین جعفری اور سرکار احمد ندیم قاسمی سے ان کو حد درجہ محبت، احترام اور عقیدت رہی اور اس کی جھلک ہمیں عطاالحق قاسمی کی تحریروں اور گفتگو میں ملتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی صاحب سے قربت اور محبت کس نوعیت کی ہوگی۔ یہ عطاالحق قاسمی صاحب کے خوبصورت کالم، قاسمی اور قاسمی، میں دیکھا جا سکتا ہے۔

میرے والد بزرگوار سید فخرالدین بلے جب عارضۂ قلب میں مبتلا ہوئے تو عطاالحق قاسمی عیادت کے لیے سرگودھا تشریف لائے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ کالم نگار بیدار سرمدی بھی ان کے ساتھ تھے۔ ان دنوں ادبی مجلہ۔ معاصر۔ منظر عام پر آچکا تھا اور دنیائے ادب میں اس کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ اس حوالے سے بھی ان سے گفتگو ہوئی، باتیں تو وہ میرے والد بزرگوار سے کر رہے تھے لیکن میں سر جھکائے سنتا رہا اور بہت سی باتیں اس حوالے سے اب بھی میرے حافظے میں محفوظ ہیں۔ آنس معین کی منفرد لہجے کی خوبصورت شاعری کے حوالے سے عطاالحق قاسمی مختلف مواقع پر اپنی گفتگو اور اپنے کالم روزن دیوار سے میں بہت کچھ فرما چکے ہیں۔ سید عارف معین بلے اور سید انجم معین بلے سے بھی انہوں نے ہمیشہ برادرانہ شفقت برتی۔ اور رہی بات راقم السطور ظفر معین بلے جعفری کی تو ہمارا معاملہ ہمیشہ سے ہی بہت مختلف رہا۔ فرزندان فخرالدین بلے میں جتنی قربت، محبت اور شفقت ہم نے سمیٹی ہے، وہ ہمارا ہی اعزاز ہے۔ ہم ہی ہیں جو عطا بھائی سے مسلسل بلکہ روزانہ کی بنیادوں پر رابطے میں ہیں یا رہے ہیں۔ ہم ہی ہیں کہ جو ہر روز عطاالحق قاسمی بھائی کی نیک تمناؤں اور دعاؤں سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ جب ان سے بات ہو اور وہ والد

گرامی، جنت مکانی سید فخر الدین بلے کو اپنے مخصوص انداز میں خراج محبت پیش نہ کریں۔ آپ ہمیں بلا تردد عطا الحق قاسمی کے لاڈلوں میں شمار کر سکتے ہیں۔ لاڈلا کے جو معنی عہد موجود میں مستعمل ہیں، ان میں تو ہرگز بھی نہیں۔

ایک وقت وہ بھی آیا کہ جب عطا الحق قاسمی صاحب کو ناروے کی سفارت سونپنے کا اعلان ہوا۔ اس پر بھی بہت واویلا ہوا، مخالفت کرنے والوں نے شدت پسندانہ رویہ اختیار کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ لیکن دیگر محبان عطا الحق قاسمی کی طرح ہم نے بھی ببانگ دہل عطا الحق قاسمی کی بطور سفیر تعیناتی کے حوالے سے کھل کر حمایت میں لکھا۔ اور بار بار۔

عطا الحق قاسمی کی ناروے اور ہماری شاہ عبداللطیف بھٹائی یونیورسٹی خیر پور پوسٹنگ اور بعد میں کراچی منتقلی کے بعد بھی کبھار کا فون پر رابطہ تو برقرار رہا لیکن ملنے ملانے کے مواقع کم ہو گئے لیکن پھر عطا الحق قاسمی کا ہر برس کراچی آنے کا شیڈول ہمارے علم میں آنے لگا۔ کبھی مشاعروں کے حوالے سے، کبھی عالمی اردو کانفرنس کے حوالے سے اور یوں ہمارے تعلقات کا کنکشن بحال ہی نہیں ہوا بلکہ مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔ ہمیں احباب سے معلوم ہوتا رہا کہ عطا الحق قاسمی نے اس تعلق داری کو کس خوبصورت انداز میں نبھایا۔ جب جب اور جہاں کہیں موضوع چھڑا اور بات ہوئی تو انہوں نے محبت بھرے انداز میں سید فخر الدین بلے اور ان کی ادبی و ثقافتی خدمات کا ذکر فرمایا اور جب جب بھی ہم سے ملاقات ہوئی ہمیشہ بہت بڑے انسان، بہت بڑے باپ کی اولاد کہہ کر ہی مخاطب کیا۔

ادبی تنظیم قافلہ کے زیر اہتمام احمد ندیم قاسمی کا جشنِ ولادت ایک دو نہیں، تین نہیں بلکہ پانچ چھ مرتبہ منایا گیا۔ جس میں مستقل شرکائے قافلہ پڑاؤ کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر سلیم اختر، امجد اسلام امجد، کلیم عثمانی، شہزاد احمد، ڈاکٹر اجمل نیازی، برادرم خالد احمد اور برادر محترم عطا الحق قاسمی بھی شریک ہوئے۔ اس جشنِ ولادت میں احمد ندیم قاسمی صاحب کی شخصیت، افسانوں، شاعری، ڈراموں اور ان کے کالموں کے حوالے سے ناقدینِ ادب و صحافت نے کھل کر باتیں کیں۔ ان سے بہت سی نظمیں، غزلیں بھی سنی گئیں۔ یہ دیکھ کر ان کی صاحبزادی محترمہ ناہید قاسمی بولیں میں نے بابا سے کسی ایک نشست میں اتنا کلام نہیں سنا۔ واقعی بڑی خوبصورت محفل سجائی ہے آپ لوگوں نے اور پھر سرکار احمد ندیم قاسمی کی منہ بولی بیٹی محترمہ منصورہ احمد نے میرے والدِ محترم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا بلے بھئی بلے۔ احمد ندیم قاسمی صاحب نے فرمایا کہ طبیعت ناساز ہونے کے باعث

میں آج کی اس خوبصورت محفل میں شرکت کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا لیکن ایک تو محترم فخرالدین بلے صاحب کا حکم تھا اور دوسرے یہ کہ بیٹی منصورہ، ظفر معین بلے، نجیب احمد اور خالد احمد اس سازش میں شامل تھے۔ میری طبیعت کی خرابی سے واقف ہونے کے باوجود آج خالد احمد اور ظفر معین بلے اور منصورہ بیٹی نے فرمائش کر، کر کے اتنا کلام سنا کہ میں کیا بتاؤں۔ جناب احمد ندیم قاسمی نے کہا خالد احمد اور ظفر معین بلے کے ساتھ مل کر شرکائے قافلہ پڑاؤ نے مجھے جو پزیرائی اور توانائی بخشی ہے میں اس کے لیے جناب فخرالدین بلے صاحب کا شکر گزار ہوں۔ عطاالحق قاسمی صاحب نے بھی اس ایونٹ کو بہت انجوائے کیا اور ان کی مسکراہٹ بھی داد دیتی نظر آئی۔ دل تو کر رہا ہے کہ جو بھی۔

کہنا ہے کہو، پھر اُن کہا رہ جائے گا۔

لیکن طوالت کا خوف مجھے یہ مضمون یہیں ختم کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔ بہت سی باتیں مجھے یاد آ رہی ہیں جو مجھے لکھنی تھیں اور میں نہیں لکھ پایا۔ اس لئے میرے اندر کے ظفر معین بلے جعفری نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ نیا مضمون، میں نئے عنوان کے تحت لکھوں تا کہ حسرت نہ رہے۔ اب آخر میں پیش کر رہا ہوں میں محترم عطاالحق قاسمی صاحب کی ایک خوبصورت غزل۔ آپ بھی پڑھئے اور سر دُھنئے۔

عطاالحق قاسمی کی ایک غزل:

جو بھی کہنا ہے کہو پھر اُن کہا رہ جائے گا
قربتوں کے درمیاں بھی فاصلہ رہ جائے گا

وہ گزر جائے گا اِن رستوں سے مثلِ بادِ صبح
اور تُو اِن رہگزاروں میں کھڑا رہ جائے گا

بند کانوں سے سُنے گا تُو کھنکتی گفتگو
بھیگی آنکھوں سے اُسے بس دیکھتا رہ جائیگا

چھین لے گی صبح اِک آہٹ کا جھوٹا خواب بھی
آنکھ کی سُونی گلی میں رتجگا رہ جائے گا

تتلیاں ہجرت کریں گی موسموں کے ساتھ ساتھ
اور شہرِ گل میں آشوب ہوا رہ جائے گا

بادلوں سے آگ برسے گی فضائے شہر پر
نقش مٹ جائیں گے اِک نقشِ فنا رہ جائے گا

.....

وقت نے مہلت دی تو میں عطاالحق قاسمی صاحب کے ٹی وی ڈراموں اور خصوصاً خواجہ اینڈ سنز کے حوالے سے الگ سے ایک مضمون لکھوں گا اور اس حوالے سے جو تاثر عام ہے کہ اس میں ان کی اپنی سوانح حیات کی کچھ جھلکیاں بھی ہیں، اس پر نئے زاویئے سے بات ہوگی۔

☆☆☆☆☆

اختر حسین جعفری کی تیسویں برسی

خواب کمخواب کا احساس کہاں رکھیں گے
اے گل صبح تری باس کہاں رکھیں گے
خود ہی روئیں گے ہمیں پڑھ کے زمانے والے
ہم بھلا رنج و الم پاس کہاں رکھیں گے

.....

یہ ایک ناآسودہ خواہش کی کہانی ہے جو سخن میں در آئی ہے پیلے پھولوں سے لدے رہتے ہیں جو راہوں میں۔ ہم وہ چاہت کے املتاس کہاں رکھیں گے، اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ سر تسلیم ہے غم کچھ نہ کہیں گے لیکن یہ قلم اور یہ قرطاس کہاں رکھیں گے۔ یہ ایک فضا ہے جس کا بیان ممکن نہیں کہ یہ محسوس کرنے کا عمل ہے کہ جب تخلیق کار اپنے آپ میں گم ہو جائے کہ جنوں کی تیز بارش میں اسے پانے کی خواہش میں، میں دل کی سطح پر اکثر کھلی آنکھوں کو رکھتا تھا۔ مرے دامن کے صحرا میں گئی جھیلوں کا قصہ تھا جو بادل کی زبان میں ہواؤں کو سناتا تھا۔ یادوں کی ڈائری کھولی تو اس میں گیلے اوراق ملے کچھ کچھ لکھے ہوئے تھے تو کچھ مٹے ہوئے مگر کچھ چاند چہرے نمودار ہوتے ہیں۔ تین جون اختر حسین جعفری کی تیسویں برسی تھی برادر منظر حسین اختر کی ایک پوسٹ نظر نواز ہوئی تو جیسے بقول منیر نیازی ایک مہک بہت مانوس سے اندر معطر کر گئی۔ احمد ندیم قاسمی صاحب کی کہی ہوئی نظم دل کو چھو گئی کہ ہم تو واقفان حال میں

سعد اللہ شاہ

سے ہیں کہ اس محبت سے فیض یاب ہوئے احمد ندیم قاسمی کی جعفری صاحب سے جو محبت تھی نا قابل بیان تھی:

دل میں سوچا تھا کہ ہم عمر بسر کر لیں گے
تجھ سے نظمیں تری سنتے تیرے نغمے گاتے
بس جو چلتا تو ہم اس دور کے ویرانوں میں
چار جانب سے تری نکہت فن برساتے
ہم نے کوشش تو بہت کی مگر اے یار عزیز
ترے اوصاف نہیں ہم سے سمٹنے پاتے
یہ حقیقت ہے مسلم کہ ہر اچھا شاعر
اتنی تمثال تو دے جاتا ہے جاتے جاتے
بزم فن میں ترا کوئی نہ ہمسر نکلا
ہم ترے بعد کہاں سے ترا ثانی لاتے

.....

3 جون کو سوشل میڈیا پر اختر حسین جعفری کی ریکارڈ نظمیں چلتی رہیں دوستوں کے محبت بھرے اور آنسوؤں سے تر کمنٹس بھی گزرتے رہے مجھے پوری طرح وہ گھڑیاں یاد ہیں جب ہم لوگ ایک کالج کے مشاعرہ میں گلبرگ تھے تو خبر آگئی کہ جعفری صاحب ہمیں چھوڑ گئے۔ میرا بھی ان کے ساتھ گہرا تعلق خاطر تھا ایک جھٹکا سا لگا۔ کچھ لوگ تذبذب کا شکار تھے میں منو بھائی کے پاس آیا کہ انھوں نے مشاعرہ کی صدارت کرنا تھی۔ منو بھائی نے اگلے ہی لمحے مشاعرے کو ملتوی کر دیا اور میں سیدھا اقبال ٹاؤن کے لیے روانہ ہوا میں سٹلج بلاک میں رہائش پزیر تھا جہاں مس فرخندہ لودھی اور انور سدید جیسے ادیب رہتے تھے کچھ ہی دور عقب میں کالونی تھی جہاں اختر حسین جعفری رہائش پزیر تھے وہاں تو لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔

ایسے ہی اپنے دوست لطیف ساحل کا شعر یاد آ گیا ہے:

خواب بھی تجھ سا ہے نایاب بھی تیرے جیسا
زندگی خواب ہے اور خواب بھی تیرے جیسا

.....

ایسا پیارا اور من موہنا چہرہ تبسم لے لبریز ہونٹ مسکراتی ہوئی آنکھیں وہ سراپا محبت تھے۔ مجھے اپنے دوست اظہار شاہین کا شعر بھی یاد آ گیا تم کسی راستے سے آ جانا میرے چاروں طرف محبت ہے۔ میں نے منیر نیازی کو ان کی تعریف میں رطب اللسان دیکھا۔ ان کا کلام تو شاہکار تھا۔ مصرع مصرع تراشا ہوا سنگ مرمر کے پیکر میں، مگر سانس لیتا ہوا اور دل کی طرح دھڑکتا ہوا۔ احمد ندیم قاسمی انھیں جدید نظم کا امام کہتے تھے۔ میرا جی، ن م راشد اور مجید امجد کے بعد چوتھا نام انہی کا لیا جاتا تھا ان کی وفات پر غالباً امجد اسلام امجد نے کہا یاران کی اپنی نظم جو انھوں نے ایزرا پاؤنڈ کی وفات پر

کہی تھی کتنی فٹ آئی ہے۔ کچھ لائنیں ذہن میں ہیں:

تجھ کو کس پھول کا کفن ہم دیں
تو جدا ایسے موسموں میں ہوا
جب درختوں کے ہاتھ خالی ہیں
آ تجھے تیرے سبز لفظوں میں
دفن کر دیں کہ تیرے فن جیسی
دہر میں کوئی نو بہار نہیں

.....

یادوں کا اک ہجوم ہے کہ دل پر دستک دے رہا ہے جب میرے شعری مجموعہ 'تتھی ملتے تو اچھا تھا' کا مسودہ تیار ہوا تو میں ان کے پاس لے کر گیا انھوں نے کہا کہ پڑھنے کے بعد فیصلہ کریں گے کہ دیباچہ لکھیں گے یا نہیں۔ بہر حال انھوں نے دیباچہ عنایت کیا انھوں نے اس سے پہلے پروین شاکر اور نجیب احمد کے لیے دو دیباچے لکھے تھے۔ انہی کے حوالے سے خالد احمد اور نجیب احمد سے زیادہ قریب رہا یہ لوگ ایک خاندان تھے سچ مچ میں ایک خاندان مظہر حسین اختر اور امیر حسین جعفری دونوں خالد احمد اور نجیب احمد کو انکل کہتے۔ احمد ندیم قاسمی کو جعفری صاحب پر بہت مان تھا۔

مجھے وہ دن بھی یاد ہے جب وہ میرے گھر آئے تب میں گڑھی شاہو میں تھا۔ انھوں نے نظم سنائی ''جہاں دریا اترتا ہے'' میں نے برجستہ کہا جعفری صاحب یہ تو آپ کے آنے والے شعری مجموعہ کا نام ہونا چاہیے پھر ایسے ہی ہوا ایک مرتبہ تو علی الصبح وہ منظر کے ساتھ میرے گھر پر آئے تو اپنی محبوب مسکراہٹ کے ساتھ بولے یار تمھیں زحمت دی میں نے لفظ اچک کر کہا جعفری صاحب آپ کیا کہہ رہے ہیں آپ کے آنے کی خوشی میں بیان نہیں کر سکتا۔ چائے کے بعد ہم کسی کام سے یونیورسٹی چلے گئے۔

بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں مگر کالم تو کالم ہے ان کے روشن حروف کا حوالہ جنرل ضیا الحق نے ادبی کانفرنس میں منفی انداز میں دیا تھا۔ ظاہر ہے وہ ایک بہادر ادیب تھے جو آمریت کو کھٹکتے تھے۔ یہ ذوالفقار علی بھٹو کا نوحہ تھا چند سطور:

اب نہیں ہوتیں دعائیں مستجاب
اب کسی ابجد سے زندان ستم کھلتے نہیں
سبز سجادوں پہ بیٹھی بیبیوں نے
جس قدر حرف عبادت یاد تھے پوچھنے تک
انگلیوں پر گن لیے
اور جب دیکھا رحل کے نیچے لہو ہے

.....

یا الٰہی مرگ یوسف کی خبر سچی نہ ہو

☆☆☆☆☆

طارق مجید کی کتاب ''اردو ناولوں میں دیہی معاشرت''

ناول میں دیہات کا موضوع نیا نہیں۔ دُنیا بھر کا ادب پڑھ لیجیے، ناول اور افسانے میں آپ کو زیادہ تر دیہاتی ماحول ہی نظر آئے گا۔ خود برصغیر کے ناول نگاروں میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، پریم چند، بلونت سنگھ، احمد ندیم قاسمی اور دیگر بے شمار تخلیق کاروں کے ناولوں میں دیہات اپنی معنویت کے ساتھ دکھائی دیتا ہے اس موضوع کو عنوان بنا کر طارق مجید نے اپنا یہ مقالہ مکمل کیا ہے۔

ادبی حوالے سے طارق مجید اس کتاب کے ایک باب میں لکھتے ہیں کہ ''تہذیبی اعتبار سے پاکستان جن علاقوں سے مل کر بنا اُس کا سلسلہ چار لاکھ برس پر محیط ہے جس کے آثار موہنجوڑڑو، ہڑپہ اور ٹیکسلا میں ملتے ہیں۔ ادبی حوالے سے محمد بن قاسم کے سندھ میں آنے سے نکات ملتے ہیں۔ ہر قوم اپنی انفرادی خصوصیات سے پہچانی جاتی ہے۔ پاکستان میں آباد انسان طویل مدت میں پتھر کی تہذیب، کانسی کی تہذیب اور لوہے کی تہذیب سے گزرے ہیں۔ محمد بن قاسم کی اسلامی تہذیب کو سلطان محمود غزنوی، شہاب الدین غوری شہنشاہِ اکبر اور عالمگیر نے فروغ دیا۔ بعد میں سرسید احمد خاں، علامہ اقبال اور علامہ شبیر احمد عثمانی نے اس روایت کو جاری رکھا۔''

طارق مجید نے جہاں اس کتاب میں دیہاتی زندگی کا منظر نامہ پیش کیا ہے وہاں انھوں نے ناولوں میں سے ایسے اقتباسات بھی پیش کیے ہیں، جن سے دیہات کی سادہ زندگی کی عکاسی ہوتی ہے۔ دیہات کے رہن سہن، بود و باش، وہاں کی رُسومات، دیہات کے پیشے جن میں زیادہ تر کھیتی باڑی شامل ہے۔ دیہات کے میلوں ٹھیلوں کا ذکر، دیہات کے اوزار و ہتھیار کا تذکرہ اور دیگر تمام متعلقہ امور کے متعلق جہاں طارق جاوید نے خود تحقیق کی ہے وہاں مختلف ناولوں سے اقتباس بھی پیش کیے ہیں جو اس موضوع کی اہمیت کو اُجاگر کرتے ہیں۔ غلام عباس کے ایک ناولٹ ''گوندنی والا تکیہ'' کا ایک منظر یوں پیش کیا گیا ہے۔

''یہ تکیے غریب غربا اور ناخواندہ لوگوں کے لیے وہی کام دیتے ہیں جو امرا اور پڑھے لکھے طبقے کے لیے شہر کے کلب گھر۔ مقصد دونوں کا تفریح بہم پہنچانا تھا یہ اور بات ہے کہ ایک بہت سستی قسم کی تفریح ہوتی تھی اور دوسری بہت مہنگی قسم کی۔ ان تکیوں پر کبھی پنجابی کا کوئی مشاعرہ اس کا محرک

آفتاب خان

ہوتا تھا کبھی دو نامی گرامی گویّوں کا استادی مقابلہ، کبھی حال وقال کی کوئی محفل۔''

یہ کتاب چونکہ 1947 سے 1960 کے عرصہ کی جائزہ نگاری پر مشتمل ہے اس لیے اس میں 1940 سے پہلے لکھے گئے ناولوں کا تذکرہ ہے اور جن ناول نگاروں کے ناولوں کا حوالہ دیا گیا اُن میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، احمد شجاع پاشا، غلام عباس، فضل احمد کریم فضلی، امرتا پریتم، احمد ندیم قاسمی، رشید اختر ندوی وغیرہ شامل ہیں۔ ان ناول نگاروں کے ناولوں سے لمبے لمبے اقتباسات دیئے گئے ہیں، جو اس موضوع کو سمجھنے میں آسانی فراہم کرتے ہیں۔ ان اقتباسات کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ناول نگاروں نے دیہات کو جس باریکی سے دیکھا ہے اور جس گہرائی سے ان کا مشاہدہ کیا ہے شاید اس طرح خود اُن دیہاتیوں نے بھی اپنے دیہات کو نہیں دیکھا ہوگا۔ بلاشبہ ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں کہانیوں کے ساتھ ساتھ دیہاتی مناظر کی ایسی خوب صورت تصویر کشی ہے کہ جسے پڑھ کر ہر منظر آنکھوں کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے اور اس کے لیے کسی فلم یا کوئی ویڈیو دیکھنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی ہے۔

بلاشبہ اردو کے سبھی اہم ناول نگاروں نے دیہات کو ایک خاص تناظر میں دیکھا اور یہ محسوس کیا کہ جو مسائل اور کہانیاں دیہاتیوں میں ہیں وہ شہری زندگی میں کم کم دکھائی دیتی ہیں۔ دیہات کی صبحیں شاندار اور شامیں طرحدار ہوتی ہیں۔ وہاں کی دوپہریں کسی پیپل کے نیچے بیٹھی الھڑ مٹیار کی کہانیاں سناتی ہیں اور وہاں کی رات چاند سے باتیں کرنے والے نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکنیں فضا میں بکھیرتی ہیں۔ یہ سارے مناظر تصور کی آنکھ سے ایک ناول نگار ہی دیکھ سکتا ہے اور جب وہ ان تصویروں کو لفظوں کی زبان دیتا ہے تو خاموشی گفتگو بن جاتی ہے اور الفاظ آپ کے دل کی آواز بن جاتے ہیں۔

طارق مجید نے اپنے مقالے کے لیے ایک بہترین موضوع کا انتخاب کر کے اُسے نہایت عرق ریزی سے مقالے کی شکل دی ہے۔ دیہی معاشرت کی ایک خوب صورت تصویر بنا کر ہمارے سامنے پیش کی ہے، جس پر کسی پینٹنگ کا گمان ہوتا ہے۔ انھوں نے نہ صرف خود دیہاتی زندگی کا ماحول پیش کیا ہے بلکہ ناولوں میں سے ایسے اقتباسات منتخب کیے ہیں جن سے دیہات کا مکمل نقشہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ اپنے موضوع کے ساتھ طارق مجید نے پورا پورا انصاف کرتے ہوئے ادب کے طالب علموں کے لیے ایک کارآمد کتاب کا اضافہ کیا ہے۔

مجھ جیسے جن طالب علموں نے ماضی کے کلاسیک ناول پڑھ رکھے ہیں اور جن ناولوں کا اس کتاب میں ذکر ہے وہ بلاشبہ عہد ساز ناول ہیں اور اس کتاب میں باردگر اُن کے اقتباسات کا مطالعہ کر کے وہ ناول دوبارہ پڑھنے کی تمنا جاگ اُٹھتی ہے۔ اس کا سارا کریڈٹ بھی طارق مجید کو جاتا ہے کہ انھوں نے ایک دلچسپ اور اہم موضوع پر قلم اُٹھا کر ماضی کے بعض فراموش شدہ اور بعض مقبول ناولوں کی یاد تازہ کر دی ہے۔ میں انھیں ہر دو لحاظ سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

☆☆☆☆☆

استغاثہ.....آخر کیوں؟

اس وقت جب کہ ملک میں سیاسی سطح پر بہت سے خلفشار ہیں اور سیاسی، سماجی اور معاشی سطح پر ایک انتشار کی کیفیت ہے، ملک میں آزادی اور غلامی کے حوالے سے مختلف نعرے جیسے ''ہم کیا غلام ہیں'' سنائی دے رہے ہیں۔ اختیار اور اقتدار کی رسہ کشی جاری ہے۔ ایسے حالات میں غافر شہزاد صاحب اپنا ''استغاثہ'' ناول کے قاری کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ مجھے ایسے لگتا ہے جیسے یہ ناول ملکی حالات نے غافر شہزاد سے لکھوایا ہے، وہ اگرچہ اپنے ناول میں ایک سرکاری ملازم کی نادیدہ غلامی کا قصہ لے کر اس ناول میں ہمارے سامنے اکیسویں صدی کی زندگی کے حقیقی منظر نامہ کو رکھ رہے ہیں مگر یوں لگتا ہے کہ ایک سطح پر یہ سیاسی حوالے سے ایک عام پاکستانی شہری کا استغاثہ بھی ہے جسے حالات کے جبر اور اقتدار کی قوتوں نے بے بسی کے اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں حقیقی آزادی نام کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔

سرمایہ دارانہ نظام نے اس وقت دنیا کو اپنے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے۔ صنعتی انقلاب کے دور میں یہ بات مکمل یقین سے کہی جاتی تھی کہ صنعتی مزدور، اکٹھے ہو کر اپنے حقوق کے حصول کے لیے جنگ کریں گے۔ سرمایہ داروں نے ٹریڈ یونین پر پابندی لگائی اور مزدوروں کے اتحاد و یگانگت کی دیواروں میں دراڑیں ڈال کر انھیں کمزور

شاہدہ دلاور شاہ

کر دیا۔ ریاست نے اپنی ذمہ داریاں پرائیویٹ سیکٹر پر ڈال کر منڈی کی معیشت کو انھی قوتوں کے حوالے کر دیا، اس کے لیے دلیل یہ دی گئی کہ کھلے مقابلے کی فضا میں منڈی کی قوتیں اشیا کی قیمتوں کا تعین خود کریں گی۔ مگر ہوا یہ کہ منڈی کی قوتوں نے مناپلی کر لی اور اشیا کی قیمتوں کو ڈیمانڈ اور سپلائی کے اصول کے حوالے کر دیا۔ یہاں تک کہ ڈیمانڈ اور سپلائی کو بھی کنٹرول کیا جانے لگا۔ یوں سرمایہ داری کو منافع کمانے کے خوب مواقع ملے۔ دوسری جانب سرکاری اداروں میں بھی ترقیاتی منصوبوں کے ٹھیکوں میں سرکاری اداروں کے سربراہ سرمایہ داروں کی طرح کاروباری ذہنیت لے آئے اور حکومتی بجٹ میں شامل ترقیاتی منصوبوں میں سے اپنا حصہ وصول کرنے لگے، اس عمل نے سرکاری اداروں میں کرپشن کو فروغ دیا۔ ایسی خوشحال پوسٹوں کی قیمت لگنے لگی اور سرمایہ دارانہ ذہنیت نے ریاست کے ان اداروں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

ایک جمہوری ریاست کا سربراہ عوام کے حقوق کی بحالی کا ضامن ہوتا ہے۔ ریاست عام شہریوں کو زندگی کی بنیادی سہولتیں اور تحفظ مہیا کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ معاش اور معیشت کے ذرائع پیدا کرنا اور حاکم اور محکوم کے درمیان عزت و وقار کا رشتہ قائم کرنا ایک جمہوری ریاست کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ جمہوریت میں ادارے ہی بنیادی ڈھانچہ ہوتے ہیں۔ اداروں میں کام کرنے والے سرکاری ملازم اداروں کو فعال رکھتے ہیں۔ سب کے ذمہ اپنا اپنا کام ہوتا ہے اور ایک ملکیت کا احساس ہوتا ہے جو ملازموں سے کام کرانے کا بنیادی محرک ہوتا ہے۔ انھیں ایسا نہیں لگتا کہ وہ کسی مجبوری کے تحت، کسی کی غلامی میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ بل کہ اپنی ڈیوٹی کو ایک فرض سمجھتے ہوئے ادا کرتے ہیں۔ ہر ادارے کا ایک سربراہ ہوتا ہے جو اپنے اوپر کسی کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے اور اس کا ماتحت عملہ اس کے سامنے اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کا پابند ہوتا ہے۔ جب ادارے کا سربراہ اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے کسی قانون ضابطے کی پابندی نہ کرے، ایسی صورت حال میں جمہوری ڈھانچے کے یہ حاکم بادشاہ بن جاتے ہیں اور ملازمین کو غلام سمجھنے لگتے ہیں۔

غافر شہزاد کا حال ہی میں شایع ہونے والا ناول ''استغاثہ'' اپنے اندر غلامی کی نئی جہت متعارف کراتا ہے جو جدید ریاست اور اس

کے انتظامی اداروں کے اسٹرکچر میں سرکاری ملازم کی ہے۔اس غلامی سے ایک فرد کی نفسیاتی اور ذہنی سطح پر کیا تبدیلیاں آتی ہیں؟اور کس طرح اختیارات اور قانون کی جکڑ بندیوں میں اس کی زندگی سے تحرک اور تغیر کو منہا کر دیا جاتا ہے۔ کیسے اس کی تخلیقی اور انتظامی صلاحیتوں میں سڑاند آنے لگتی ہے؟ انصاف کے لیے جب وہ جج اور عدالت کے جال میں پھنستا ہے تو کیسے اس کی برین واشنگ ہوتی ہے ۔اداروں کو کاروباری اڈے بنانے والے کہاں کہاں ایسے ملازمین کو شطرنج کے مہروں کی طرح استعمال میں لاتے ہیں اور ٹشو پیپر کی طرح دفتر کے ڈسٹ بن میں ناکارہ بنا کر پھینک دیتے ہیں۔ یکسانیت کا شکار یہ لوگ گردشِ لیل ونہار میں آ کر کیسے اپنی فطری صلاحیتیں زنگ آلود کر بیٹھتے ہیں؟ یہ ساری صورت حال اور اس کے جوابات ہمیں استغاثہ میں پڑھنے کو ملتے ہیں۔

غافر شہزاد کے دیگر ناولوں کی طرح ''استغاثہ'' میں بھی کئی کہانیاں اور کردار متوازی چلتے ہیں۔ایک دوسرے کے ساتھ جان پہچان اور تعلق بنائے بغیر ناول کی کہانی کی بساط بچھاتے ہیں۔ جہاں مہرے اپنے کھلاڑی کے ہاتھوں کٹھ پتلیوں کی طرح کھیل میں حصہ لیتے ہیں، جس میں مہروں کو کچھ نہیں ملتا البتہ ان کی شطرنج کے خانوں میں بھاگتے بھاگتے موت ہو جاتی ہے۔

ناول کے استغاثہ میں سرکاری ملازم ہی مستغیث ہے مگر سامنے بیٹھا منصف خاموش اور چپ چاپ سنتا ہے؛ کچھ تاثر نہیں دیتا، پلکیں تک نہیں جھپکتا۔ جب کہ مستغیث وکیلوں کے جھنجھٹ سے خوفزدہ ہے۔ وکیل اس کے مقدمے کو اہم نہ سمجھتے ہوئے کیس لڑنے کے لیے تیار نہیں۔ ویسے بھی مستغیث سمجھتا ہے کہ اس نے ہی مقدمے کی تمام تفصیلات وکیل کو بتانی ہیں، پھر وہ خود ہی یہ مقدمہ لڑنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ مستغیث کا یہ فیصلہ اسے کس حتمی موڑ تک لے جاتا ہے؟ یہ جاننے کے لیے ناول پڑھنا ضروری ہے۔

ناول کی ایک اور اہم بات میکنو کریٹس، بیوروکریٹس اور ایوانِ انصاف کے بے نام کرداروں کے درمیان چپقلش اور باہم محاذ آرائی ہے جو ریاست کے لیے کسی طرح بھی فائدہ مند نہیں ہے مگر ہیگل کے قانون کے مطابق تھیسز، آنٹی تھیسز اور سینتھیسز کا ایک لامتناہی تسلسل ہے جو کبھی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوتا۔

ناول میں حسبِ معمول صحافی کا کردار بہت

مؤثر اور بااختیار ہے۔ کچھ نہ ہو کر بھی وہ بہت کچھ اپنی مرضی سے سرکاری اداروں کو چلاتا ہے۔ اس کی جیب میں انفارمیشن ہے؛ وہ انفارمیشن کو متعلقہ شخص کے ہاتھوں بیچ کر اس کے اختیار اور مالی مفادات کا حصہ دار بنتا ہے۔ اس نے کچھ نہ ہو کر بھی سرکاری اداروں میں اپنی جگہ بنا لی ہے۔ اس کے وجود اور اس کے مستعار اختیار سے اب انکار ممکن نہیں رہا، اسے ایسے ہی اس کی مرضی کے عین مطابق تسلیم کر لیا گیا ہے، اب آگے اس کے لیے آسانیاں ہی آسانیاں ہیں۔ سرمایہ داری کے بعد اب انفارمیشن ٹیکنالوجی کا دور ہے جس نے عالمی معیشت کو کنٹرول کرنا ہے۔ اس کے ساتھ مصنوعی ذہانت نے کندھا ملا لیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ سرمایہ داری کے دور کی طرح انفارمیشن ٹیکنالوجی کے دور میں بھی انسان کیا ویسے ہی غلام رہتا ہے یا وہ اس غلامی سے نکل پائے گا۔ ایک امید یہ ضرور دکھائی دیتی ہے کہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے سبب اب منڈی کی معیشت مقتدر قوتوں کے اختیار میں نہیں رہی۔ کوئی فرد بھی انفرادی سطح پر اپنی اشیا دنیا کے کسی کونے میں بھی بیچ سکتا ہے اور اپنی مرضی سے قیمت مقرر کر سکتا ہے۔

غافر شہزاد کو یہ ناول لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ ایسے کون سے محرکات ہیں جن کے خمیر سے ''استغاثہ'' کی بنیادیں اٹھائی گئی ہیں۔ یہ سب جاننے کے لیے ناول پڑھنا ضروری ہے۔ میں تو صرف یہ کہہ سکتی ہوں کہ ایسے کرداروں، موضوع اور اسلوب کے اس برتاؤ جیسا کوئی ایک ناول بھی اردو فکشن میں دور دور تک دکھائی نہیں دیتا۔

یہ ناول نہ صرف ریاست، اس کے اداروں اور اس کے مہروں کے بارے میں قاری کے پرانے تصورات کو بدلتا ہے بلکہ ریاست کی غلامی کی ایک نئی تفہیم قاری کے سامنے لاتا ہے اور جو لوگ یہ کہتے نہیں تھکتے کہ ''فکشن میں کچھ بھی نیا نہیں ہو سکتا'' میری ان کو دعوت ہے کہ وہ غافر شہزاد کے ناول ضرور پڑھیں۔ ان میں انسانوں کے بنائے اس معاشرے کی حقیقی تصویر فکشن کے تخلیقی لوازمات کے ساتھ انھیں دکھائی دے گی اور ان کے اندر ایک تیسری آنکھ کھولے گی جو انھیں نئے زاویے سے اشیا، کردار اور واقعات کی تفہیم کرنے کی صلاحیت پیدا کرے گی۔ غافر شہزاد کے ناول موضوع، ٹریٹمنٹ، اسلوب اور پیش کش کے حوالے سے مختلف اور منفرد ہیں، اکیسویں صدی کے فکشن میں انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔

☆☆☆☆☆

نوید صادق کے شعری مجموعہ ''مسافت'' پر ایک نظر

ایک روز میں استادِ محترم نثار ترابی کے گھر بیٹھا تھا کہ میری نظر ان کی آنے والی ڈاک پر پڑی، جس میں چند کتابیں موجود تھیں۔ میں نے ان میں سے ایک کتاب نکال کر اس کی ورق گردانی شروع کر دی۔ اس کتاب کا پہلا ہی مضمون ''خواب سرا کا آدمی'' جو کہ شاہد ماکلی نے تحریر کیا تھا اس کو پڑھنے کے بعد مجھے نوید صادق سے ملنے کی خواہش پیدا ہو گئی کہ اک بار ان سے ملاقات ضرور کرنی ہے۔ ان صفحوں کو پڑھتے پڑھتے میں اس قدر محو ہو گیا کہ مجھے ترابی صاحب کے آنے کا پتہ ہی نہ چلا' میں نے ترابی صاحب سے کتاب لی کہ میں اس کو پڑھوں گا تو انھوں نے کتاب میرے حوالے کی اور ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ''اس پر اپنی ائے بھی ضرور لکھ کے لائیے گا۔''

ابھی میں نے کتاب کے کوئی چالیس صفحات ہی دیکھے تھے کہ میں سوچ میں پڑ گیا کہ اس پر کیا لکھوں اور کیسے لکھوں۔ ڈاکٹر خورشید رضوی، انور شعور، خالد علیم اور شاہد ماکلی نے اتنا کچھ بیان کر دیا تھا کہ ان کے آگے مزید کچھ لکھنے کی گنجائش نظر نہیں آ رہی تھی۔

دو دن سے میری طبیعت موسم کی تبدیلی کی وجہ سے ناساز تھی اور کل جلدی ہی سو گیا تھا۔ رات کوئی ساڑھے بارہ بجے آنکھ کھلی طبیعت انتہائی بوجھل تھی اور خیالات کی پٹاری کچھ اس طرح سے کھل پڑی تھی کہ ایک کے بعد ایک خیال بڑی تیزی سے ذہن میں گھوم رہا تھا کہ اچانک نوید صادق صاحب کا خیال آیا اور پورا مضمون اس طرح سے اللہ رب العزت نے

خالد صدیقی

میرے ذہن میں اتار دیا کہ اس طرح سے شروع کروں۔

نوید صادق کتاب کا آغاز حضرت محمدؐ کی نذر ایک شعر سے کرتے ہیں جو ان کے دل میں بسی عقیدت رسولؐ کا غماز ہونے کے ساتھ ساتھ آپؐ کی ذات اقدس سے گہری وابستگی کا اظہار بھی ہے۔

جو داغ دل پہ لگے تھے، وہ دھو کے آیا ہوں
میں خوش نصیب، مدینے میں رو کے آیا ہوں

.....

کسی استاد کے لیے یہ بات بہت ہی فخر کی ہوتی ہے کہ اس کا شاگرد اس سے بھی آگے نکل جائے کیوں کہ وہ اس پر بڑی دل و جان سے محنت کر رہا ہوتا ہے اور شاگرد کے لیے یہ بات بہت اہم ہوتی ہے کہ وہ اپنے استاد کے ہر حکم کی پاس داری کرے، اُس کی بتائی ہوئی ہر بات پر عمل کرنے کی بھی کوشش کرے۔ اس کے لیے یہ بات بھی بہت ہی اہم ہوتی ہے کہ بے شمار شاگردوں میں سے استاد کسی ایک کو چنے اور اس کی حوصلہ افزائی کرے۔ نوید صادق بھی ان خوش نصیبوں میں سے ہیں جہاں ان کی اس کتاب ''مسافت'' کے فلیپ پر ان کے استاد محترم خالد علیم صاحب نوید صادق صاحب کی کچھ اس طرح حوصلہ افزائی کر رہے ہیں:

''وہ بنیادی حیثیت میں ایک ایسا صاحب نظر شاعر ہے جو نظم ہو یا غزل دونوں میں اپنے شعری اظہار کی یکساں تخلیقی قوت کے ساتھ اپنے فکر و ہنر کا نمایاں ثبوت دیتا ہے۔ ادب و فن پر اس کا مطالعاتی تناظر اس کے شعری سفر میں ساتھ ساتھ چلتا ہے اور جب وہ غزل کہتا ہے تو غزل کے پورے مزاج میں ڈھل کر اور جب نظم پر طبیعت آمادہ ہو تو یہ آمادگی ایک عمدہ بلکہ منفرد طرز اظہار کی نظم کے طور پر ظہور پذیر ہوتی ہے۔''

اور جب آپ نوید صادق کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو بالکل اس طرح محسوس ہوتا ہے کہ وہ شاید آپ کے لیے ہی لکھی گئی ہے اور اتنے سادہ اور شستہ لہجے میں کہی گئی ہے کہ ہر شخص اس کو بآسانی سمجھ سکے جیسے کہ:

صبح اخبار میں پڑھا تھا نوید
شام تک ہو گا صرف واویلا

پتھر سے گریز کیا ، گلہ کیا
شیشہ تھا ، ذرا ترخ گیا ہوں

جو بات غلط ہے ، بس غلط ہے
میں آخری بار کہہ رہا ہوں

.....

نوید صادق نہ صرف ایک سادہ طبیعت آدمی ہیں بلکہ ملنسار اور دوست شناس شخصیت بھی ہیں۔ آپ کا حسن سلوک، آپ کے لہجے

میں موجود جو چاشنی اور شیرینی ہمیں ان کی شاعری میں ملتی ہے وہی لب ولہجہ ان کی عام زندگی میں بھی ان کے اندر بدرجہ اتم ملتا ہے۔ وہ دوستوں کے دوست اور انسانی اقدار کی قدر رکھنے والی شخصیت کے مالک ہیں، جو شعرا اور ادیب نوید صادق کو قریب سے جانتے ہیں وہ اس بات کی بہتر ترجمانی کر سکتے ہیں۔ نوید صادق اپنے دوستوں کو یاد کرتے ہوئے یوں مخاطب ہوتے ہیں:

خالد احمد یاد آتے ہیں مجھے جب بھی نوید
اُن در و دیوار، اُن گلیوں سے مل آتا ہوں میں

وہ گلی وہ جانی پہچانی گلی
ہو گئی اک داستاں ، افسوس میں!

.....

نوید صادق کے بارے میں انور شعور کچھ اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں جو اُن کے پورے تشخص کی بھرپور عکاسی کرتا ہے:

"اُن کا اپنا پن میرے لیے لفظوں میں بیان کرنا دشوار ہے۔ صرف اتنا کہوں گا کہ مجھے انھوں نے پہلی ہی ملاقات میں فتح کر لیا تھا۔ آج کل ایسا دوست خوش نصیبی ہی سے ہاتھ آتا ہے۔"

نوید صادق کی تخلیقی کاوشیں فنی و ادبی لحاظ سے اپنے تمام آداب کو ملحوظ خاطر رکھتی ہیں کہ "اک دریا ہے اور ادب کے جانے کے مصداق آپ کی شاعری میں ہمیں زمانے کے اترتے چڑھتے سماجی تہذیبی مناظر اور تیزی سے گزرتے ہوئے وقت کی بھی بھرپور عکاسی نظر آتی ہے جو کہ ان کے مشاہدات، سوچ بچار غرض کے عام زندگی میں ہونے والے واقعات اور معمولات بھی بالکل اسی طرح نظر آتے ہیں جیسے کہ وہ وقوع پذیر ہو رہے ہیں اور ان کو بڑے ہی سادہ الفاظ میں بیان بھی کر دیتے ہیں۔ سچائی کے تناظر میں بات کرتے ہوئے کہتے ہیں:

مری زبان صداقت کا زہر اگلنے لگی
میں اپنے آپ سے یک سر مکر نہ جاؤں کہیں

.....

حالات کے تناظر میں اپنے جذبات اور خیالات کا کچھ اس طرح سے اظہار کرتے ہیں:

اچھے کٹے، برے کٹے، ایک ہی رو میں کٹ گئے
شہر میں ایک گردھی، گردے سے پھول کٹ گئے
جاؤ نوید شہر میں، دیکھو وہاں کہ کچھ رہا؟
میرے تو جنگلوں کے رات سارے درخت کٹ گئے

.....

آخر میں یہ دعا کہ اللہ تعالیٰ نوید صادق کو صحت و تندرستی کے ساتھ اسی طرح نئی نئی تخلیقی کاوشوں کے اظہار کو پیش کرنے کی سعادت نصیب فرمائے۔ آمین

☆☆☆☆☆

خالد احمد — جتنا مَیں جان سکا

یہ غالباً جون ۲۰۱۰ کی بات ہے۔ مَیں لاہور کے چند روزہ قیام کی ایک شام الحمرا ادبی بیٹھک کے لیے روانہ ہوا۔ ادبی بیٹھک پہنچا تو ہال کا دروازہ نیم وا تھا۔ مَیں اندر داخل ہوا، دروازے کے بالکل سامنے والی دیوار کے ساتھ دائیں جانب ایک میز کے گرد لگی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر میرے میزبان کچھ کاغذات سامنے رکھے، سگریٹ سلگائے، داخلی دروازے کی سمت پشت کیے بیٹھے تھے۔ کچھ اور لوگ بھی وہاں موجود تھے۔ مَیں میزبان کی کرسی کے قریب پہنچا اور مصافحہ کرنے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھا کر اپنی فطری آواز اور انداز کے ساتھ بولا: ''سر! مَیں سائل نظامی، گوجر خان سے۔'' میزبان نے گردن گھما کے میری طرف دیکھا اور بے ساختہ انداز اور بے تکلف لہجے میں گویا ہوئے: ''ارے تمھیں تو کسی ریڈیو پہ پروگرام کرنا چاہیے، تمھاری آواز ریڈیو کے مزاج والی ہے۔'' مَیں نیازمندانہ انداز سے مسکرایا اور اس حوصلہ افزائی پہ شکریہ ادا کیا، پھر ساتھ پڑی خالی کرسی پہ بیٹھ گیا۔ حال احوال معلوم کرنے کے کچھ دیر بعد میزبان نے اچانک مجھے مخاطب کر کے کہا: ''لڑکے! تم نعت بڑی اچھی پڑھتے ہو، نعت سناؤ۔'' مَیں لمحہ بھر توقف کے بعد بولا: ''سر! میری تو آواز ترنم کے لائق نہیں، نعت میرے بڑے بھائی پڑھتے ہیں۔'' میزبان بولے: ''بڑے بھائی پڑھتے ہیں تو تمھیں نعت سے انکار کیوں ہے؟ جو نعت وہ زیادہ پڑھتے ہیں، وہی سنا دو۔'' مَیں اپنی آواز کے غیر مترنم ہونے کے ادراک کے بعد پہلی بار نعت پڑھنے کی کوشش کرنے کو تیار ہو گیا۔ قاسمی صاحب کی لکھی ہوئی نعت کے تین شعر بہ مشکل پڑھ پایا:

مَیں کہ بے وقعت و بے مایا ہوں
تیری محفل میں چلا آیا ہوں

آج ہوں مَیں ترا دہلیز نشیں
آج مَیں عرش کا ہم پایا ہوں

یہ کہیں خامیِ ایماں ہی نہ ہو
مَیں مدینے سے پلٹ آیا ہوں

.....

سائل نظامی

میزبان نے حوصلہ افزائی کی۔ اس کے بعد تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ شعر و ادب پر گفت گو ہوئی۔ میزبان کی شہرۂ آفاق فقرہ سازی کے کرشمے بھی بہت دیکھے۔ مجھے اپنی شاعری سنانے کا بھی حکم صادر فرمایا، جسے ڈرتے ڈرتے پورا کیا۔ اس دوران شاید ۲ مرتبہ چائے پی۔ پھر مَیں نے اجازت چاہی اور رخصت ہو گیا۔

یہ میزبان خالد احمد تھے اور یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی جو میرے دل پہ آج بھی نقش ہے اور ہمیشہ نقش رہے گی۔ خالد صاحب کی بے تکلف گفت گو، بے باک اور بے لاگ تبصرے جس کسی نے سن رکھے ہیں، وہ میری بات کی توثیق کرے گا کہ ایسے شخص سے ملاقات فراموش کی ہی نہیں جا سکتی۔ اس پہلی ملاقات کے بعد الحمرا ادبی بیٹھک ہی میں صرف ایک ملاقات مزید ہوئی اور ایک بار قاسمی صاحب کی سالگرہ کے ایک پروگرام میں الحمرا آرٹس کونسل ہی کے بڑے ہال میں خالد صاحب کو بس دور سے دیکھنے کا موقع ملا۔

خالد صاحب سے میرا پہلا تعارف میری عمر کے تقریباً ہر بندے کی طرح پی ٹی وی کے نعتیہ و سلامیہ مشاعروں ہی سے ہوا۔ انھوں نے نعت پڑھی:

رحمتِ حق پہ آپ جب بن کے گواہ آ گئے
ہم بھی گلے میں ڈال کر فردِ سیاہ آ گئے

.....

چشم براہ در پہ ہیں، لاکھ گناہ سر پہ ہیں
شاہِ اُمم! کچھ اہلِ غم بہرِ پناہ آ گئے

اس طویل نعت میں ایک شعر ایسا بھی آیا، جسے سن کر مَیں دنگ رہ گیا۔ وہ شعر سنایا تو کسی کو بھی جا سکتا ہے، لیکن اسے محسوس کرنے کے لیے ایک خاص پس منظر سے متعارف ہونا لازمی ہے:

شافعِ خیر مذنبیں! جیبِ عمل میں کچھ نہیں
ہم تو گرہ میں باندھ کر آپ کی چاہ آ گئے

.....

اس شعر میں ''جیبِ عمل'' اور ''گرہ میں بندھی چاہ'' کی نزاکت و کیفیت تک وہی شخص پہنچ سکتا ہے، جس نے اپنی ماں کو دوپٹے کے پلو میں ریزگاری سنبھالتے ہوئے دیکھا ہو۔ ہماری بھری بھرائی جیبیں، گرہ میں بندھے ان چند سکوں کا مقابلہ بھلا کیسے کر سکتی ہیں؟

پھر ماہِ محرم میں نشر ہونے والے ایک مسالمہ میں پڑھے گئے سلام کا مطلع اور ایک شعر دیکھیے:

اے لبِ گرفتگی! وہ سمجھتے ہیں پیاس ہے
یہ خستگی تو اہلِ رضا کا لباس ہے

ممکن ہے کس طرح وہ ہماری خبر نہ لیں
ہر سانس تارِ پیرہنِ التماس ہے

.....

مَیں جس دور کی بات کر رہا ہوں، اس وقت میری عمر ۱۴ سے ۱۵ سال تھی۔ اس عمر میں اس معیار کی زبان کا اگرچہ مکمل وقوف نہ تھا، لیکن اپنی کیفیت اور سوز کی وجہ سے یہ شاعری میرے دل و دماغ پہ نقش ہو گئی۔

بات یادوں کی ہو رہی ہے تو خالد صاحب کی

فقرہ سازی کا ایک واقعہ بھی سناتا چلوں۔ قاسمی صاحب کی سالگرہ کے جس پروگرام کا ذکر کیا، اس کی صدارت غالباً محترمہ ناہید قاسمی فرما رہی تھیں، ان کے ساتھ سٹیج پہ خالد احمد اور خورشید رضوی بھی تشریف فرما تھے۔ جناب احمد عقیل روبی کو گفتگو کے لیے بلایا گیا۔ دریں اثنا ۔ خالد صاحب، خورشید رضوی صاحب سے کچھ بات کر رہے تھے۔ روبی صاحب نے صاحبِ صدارت سے اجازت لے کر چند ثانیے توقف کیا، پھر توجہ دلانے کے لیے خالد صاحب کو مخاطب کیا "خالد صاحب! اجازت ہے؟" خالد صاحب برجستہ بولے: "صدارت مَیں کر رہا ہوں؟"

ادبی بیٹھک میں ہونے والی دوسری ملاقات کے دوران ایک صاحب نے کسی اور شاعر کا ایک شعر سنایا۔ جس کا مضمون چاند رات میں محبوب سے ملاقات کرنے کے حوالے سے تھا۔ خالد صاحب نے ازراہِ مذاق تبصرہ کرتے ہوئے کہا: "بھئی ان شاعروں کی حالت دیکھو۔ رمضان گزرتے ساتھ ہی چاند رات کو محبوب کے ساتھ ملاقات کی ایسی کیا آفت آن پڑی؟ کچھ صبر کر لیں۔ مجھے لگتا ہے کہ روزے رکھ رکھ کر وہ جو---وہ کیا کہتے ہیں--- وہ---" اب خالد صاحب اپنے مافی الضمیر کے درست ابلاغ کے لیے مناسب لفظ یاد کر رہے تھے جو ان کی زبان پہ نہیں آ رہا تھا۔ اچانک شعر سنانے والے صاحب بولے: "Frustation"۔ بس یہ لفظ سننا تھا، پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ خالد صاحب بولے: "ایہہ تے حالت اے تہاڈی۔ یعنی رمضان دے روزے تے عباداں نال تہانوں Frustation ہندی اے؟ تیری ہمت کیویں ہوئی ایہہ گل کہن دی؟ اوئے منڈیو! اٹھو۔۔۔ ایہنوں لمیاں پاؤ تے لتر پھیرو۔۔۔ اٹھو۔۔۔ جے تسی نئیں اٹھدے تے مَیں باہروں گارڈ نوں بلا لواں گا۔ اَج دی ساڈا دین ۱۴۰۰ سال توں اَن پڑھاں دے سر تے ٹُر رہیا اے۔ پڑھ لکھ کے لوک بے غیرت ہو جاندے نیں۔" یہ جملہ سننا تھا کہ مَیں سکتے میں آ گیا۔ مجھے ۱۴۰۰ سال کا تو علم نہیں، لیکن اپنی زندگی میں اپنی آنکھوں کے سامنے مجموعی طور پہ جو کچھ دیکھا، اس کے مطابق خالد صاحب کا جملہ صد بہ صد درست ہے۔

عربی زبان کا ایک مقولہ ہے: "اَحْسَنُ الشِّعْرِ اَکْذَبُ۔" یعنی سب سے اچھا شعر وہ ہے، جس میں سب سے بڑا جھوٹ بولا جائے۔ خالد صاحب کا ایک "آدھا اچھا شعر" دیکھیے:

اے راندۂ دُنیا! تجھے کیا غم؟ کہ مجھ ایسے
پروردہ دُنیا کو بھی راس آئی نہ دُنیا

محبانِ خالد! "آدھا اچھا شعر" کہنے پہ معذرت نہیں کروں گا۔ کیونکہ اس شعر میں "مجھ ایسے پروردہ دُنیا" جتنا بڑا جھوٹ ہے، "راس آئی نہ دُنیا" اُتنا ہی بڑا سچ۔ ہر چند کہ خالد صاحب سے میری صرف ۲ ملاقاتیں ہیں، مگر مَیں یہ بات دعوٰی کے ساتھ کہہ سکتا

ہوں کہ خالد احمد ''پروردہ دُنیا'' نہیں تھے۔ مَیں ''پروردہ دُنیا'' شاعروں کی شاعری سے آشنا ہوں - وہ اپنے چھوٹے چھوٹے نقصانوں پر بھی سب سے پہلے خدا کو آڑے ہاتھوں لیتے ہیں۔ خالد احمد تو اپنی زندگی کے سب سے بڑے نقصان پر بھی کہتے ہیں:

مِرے آقا!
مَیں اپنے پالنے والے سے پہلے
آپ کے بابِ شفاعت پر یہ بُوڑھی ہڈیاں
لے کر کھڑا ہوں
تاکہ مَیں اپنے وسیلے کے لیے اکمل
شفاعت کی ضمانت مانگ لوں
اور آپ کی اکمل شفاعت کے بھروسے پر
مَیں اپنے پالنے والے سے اپنی ماں کی
خاطر جنت الفردوس کا طالب بنوں
اپنے وسیلے کے لیے

....

''ربِ محبت'' سے مکمل مغفرت چاہوں۔۔۔!

مَیں جدیدیت، مابعد جدیدیت، ساختیات، پس ساختیات وغیرہ کے بارے میں اتنا ہی جانتا ہوں، جتنا ان تمام ابحاث میں اُلجھے ہوئے لوگ ''شعریت'' کے بارے میں جانتے ہیں۔ مَیں شاعری کو اوّلاً سلیقے اور ثانیاً کیفیت کی سطح پہ پرکھتا ہوں۔ خالد صاحب کی جس نظم کی چند سطریں پیش کی ہیں، اس نظم کے بارے میں صرف یہ کہوں گا کہ اگر آپ کے نزدیک رونا صرف عورتوں کا کام ہے تو ہرگز یہ نظم مت پڑھیے گا، کہیں آپ لفظ کی توہین کے مرتکب نہ ٹھہریں۔

موضوعِ سخن خالد احمد ہیں تو بات ''بناؤں'' گا نہیں، جو ہے، جیسی ہے، کہہ دوں گا۔ خالد صاحب کی رحلت تو ۲۰۱۳ میں ہو گئی تھی، لیکن مجھے ان کے چلے جانے کا یقین ۲۰۱۴ میں آیا۔ معاملہ یہ ہے کہ تہذیب اور روایت کا تقاضا ہے کہ کوئی انعام یا ایوارڈ جس کے ہاتھوں سے دیا جائے، اس کا ایوارڈ لینے والے سے سینئر یا کم از کم ہم پلہ ہونا لازم ہے۔ لیکن ۲۰۱۴ میں خالد صاحب کی سالگرہ پر برپا ہونے والے پہلے خالد احمد ادبی ایوارڈ کی تقریب میں خالد صاحب کے پسندیدہ شاعر اور دیرینہ دوست حضرت خورشید رضوی کو ایک ایسی شخصیت کے ہاتھوں سے ایوارڈ دلوایا گیا، جو محض سر کے بال جھڑنے کے اعتبار سے خورشید صاحب سے سینئر ہیں۔ اگر اس دن خالد صاحب اس محفل میں بہ نفسِ نفیس موجود ہوتے تو منتظمین کے ساتھ کیا ہوتا؟ یہ منتظمین مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ جناب اسحاق وردگ کا شعر ہے:

آؤ سنتے ہیں نئے شہر کے حاکم کا خطاب
بات کرتا ہے تو لگتا ہے کہ مَیں بولتا ہوں

کم از کم مجھے شہر کا حاکم تو آج تک ایسا نہیں ملا، جس کی بات مجھے اپنی بات لگی ہو، لیکن دو شاعروں کے بارے میں مجھے ہمیشہ یہی لگتا ہے کہ ان کے کئی شعر میری واردات ہیں: منچندہ بانی اور خالد احمد۔ اپنے کمزور حافظے سے خالد صاحب کے چند ایسے شعر

پیش کر رہا ہوں، جو کہیں نہ کہیں میری بات،
میری واردات ہیں:
کیا مَیں نے کیا ہے کہ سزاوارِ روا ہوں؟
مجھ کو تو بہت ہے تری کملی کی جھلک بھی

زندگی بھر یہ بوجھ ڈھونا ہے
آگہی عمر بھر کا رونا ہے

کم نظر روتے رہے ہم نظروں کا رونا
دیکھتا کون ترے دیدہ وروں کا رونا!

تا حدِ محبت تری یادوں کا دھواں تھا
رویا مگر اتنا کہ بس اندھا نہ ہُوا مَیں

خالد وہ تھکن تھی کہ تہِ سایۂ مژگاں
دیوارِ خمیدہ کی طرح بیٹھ گیا مَیں

یہ دل طاق چراغ زر نہ ٹھہرے
مرے مالک! مجھے نادان رکھنا

مرے حالات مجھ کو چھُو نہ پائیں
مجھے ہر حال میں انسان رکھنا

ہری رکھنا مرے مولا! یہ آنکھیں
دُکھوں کی بارشوں کا مان رکھنا

دُنیا نے اُس کو رنگ لیا اپنے رنگ میں
اُٹھ اے سرِ نیاز! وہ یکتا نہیں رہا

ریزۂ سنگِ انا تھا راہ کا کوہِ گراں
بڑھ کے لگ جاتا مرے سینے سے، ایسا کون تھا؟

کسی دروازے پہ رہ جاتی ہیں خالی آنکھیں
کسی دہلیز پہ سر چھوڑ دیا جاتا ہے

بات سے بات نکلنے کے وسیلے نہ رہے
لب رسیلے نہ رہے، نین نشیلے نہ رہے

اشک برسے تو دروں خانۂ جاں سیل گیا
درد چمکا تو در و بام بھی گیلے نہ رہے

دُنیا فقط گماں ہے، سب کچھ درونِ جاں ہے
جاگو ضرور خالد! آنکھیں مگر نہ کھولو

شہر کا شہر اجنبی رہتا
کاش کرتا نہ گفتگو وہ بھی

اِسی تنگ و تار اُطاق میں، اِسی کُنج کے کسی طاق میں
غمِ یار رکھ کے گیا تھا مَیں، غمِ روزگار یہیں کہیں

ترکِ تعلقات پہ رویا نہ تُو نہ مَیں
لیکن یہ کیا کہ چین سے سویا نہ تُو نہ مَیں

جنابِ اظہر عنایتی کا ایک شعر، خالد صاحب کے لیے:
راستو! کیا ہوئے وہ لوگ کہ آتے جاتے
میرے "آداب" پہ کہتے تھے کہ "جیتے رہیے!"

☆☆☆☆☆

لیوٹولسٹوئی کے ناول ''اینا کیرینینا'' کا تجزیاتی مطالعہ [بقیہ حصہ]

نبیل احمد نبیل

ٹولسٹوئی کی زندگی میں یہ صورت حال بہت اہم تھی کہ ۱۸۶۱ء میں روس میں کمیروں کے نظام کا خاتمہ ہوگیا اور جاگیردارانہ اُمراو رؤسا کے روایتی طرزِ زندگی کو اِس کا بہت غم ہوا، لیکن پرانے رسم و رواج کے خُوگر عہد رفتہ کے کروفر اور خود اپنے طبقے کو انسانی وقار کا نمونہ بنا کر پیش کرنے سے محروم ہوگئے۔ یہ وہ انقلاب تھا جس نے روس کے اداروں کو اندر سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ اُس وقت کے ماحول میں ''آنا کارینینا'' کے ذہنی اور معاشرتی ماحول میں بدحالی اور عدم تحفظ کے آثار واضح نظر آتے ہیں۔ اِس صورت حال کو ٹولسٹوئی نے ان الفاظ میں لکھا ہے۔

''اُن کی آمد کے اگلے دن موسلا دھار بارش ہوگئی... گلیارے اور بچوں کے کمرے کی چھت رات بھر ٹپکتی رہی اور ان کے پلنگ ڈرائنگ روم میں منتقل کروانے پڑے۔ باورچی کا دور دور پتا نہ تھا... گوالنوں کے بیان کے مطابق نو گایوں میں سے کچھ گابھن تھیں، کچھ نے پہلی بار بچھڑے، بچھیاں جنی تھیں، کچھ بڈھی ہو چکی تھیں اور بعض کے تھن سوکھ گئے تھے۔ مختصر یہ کہ بچوں کی ضرورت بھر دودھ مکھن بھی موجود نہیں تھا انڈے عنقا تھے۔ مرغیاں حاصل کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ لے دے کر بس

گائے بکری کا گوشت اور چربی والے بڑھے مرغے تھے... چاہے ابال ابال کر کھاتے رہو، چاہے تل کر... فرش کی دھلائی صفائی تک کے لیے مائی ملنا ممکن نہیں تھا... گاؤں کی سب عورتیں آلو کے کھیتوں میں کام سے لگی ہوئی تھیں''۔(۲۰)

اسی طرح تالستائے کے سفاک اور بے باک قلم نے اس وقت کی سماجی صورت حال کی نقاشی کی ہے... ایک علامتی سی تصویر جو ٹولسٹوئی نے بنائی تھی وہ حقیقت کے بالکل قریب تھی۔

''یہ وہ دور ہے جہاں ٹھہری ہوئی زندگی درہم برہم ہو رہی تھی اور انسانی مسائل خواہ دل و دماغ کے ہوں، خواہ جینے کے، اندھیرے مستقبل کے زنداں میں بند تھے، جن سے بے نیاز رہ کر آدمی نباہ نہیں کر سکتا''۔(۲۱)

اوپر جن حالات کی تصویر کشی کی گئی ہے اُس میں آننا کی ذاتی زندگی تشویش اور ذات کی نفی کے مرحلے سے گزرتی ہے اور ایک المیے کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ دراصل ٹولسٹوئی کے قلم کی مسیحائی نے ''آننا کارینینا'' کے مرکزی کردار کو اُس عہد کی جیتی جاگتی بولتی چالتی متحرک تصویر بنا دیا ہے۔ جہاں تک کردار نگاری کا تعلق ہے وہاں ٹولسٹوئی اپنے ہم عصروں میں بے مثل نظر آتا ہے۔ اس کی تحریر میں جزئیات نگاری اور اُس میں معنی خیز سادگی اور بے ساختگی نے کرداروں کو تصور سے زیادہ حقیقت کے پیکر میں اس طرح ڈھالا کہ وہ جاوداں ہو گئے۔ کارینینا کا کردار اُس عہد کی طوائف الملوکی، بدحالی، شکست و ریخت، انتشار اور بے چارگی کی حقیقی تصویر بن گیا۔ یہ تصویر رمزیت کی اعلیٰ مثال ہے۔ اُردو کا قاری اِس رمزیت کو اپنی حسیت اور اپنے تجربوں کے زاویے سے دیکھے گا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو بھی آئیں گے اُسے اپنی شکست و ریخت کا احساس بھی ہوگا۔ صرف یہی نہیں وہ مطالعہ کار جو ادب اور جمالیات سے اپنے شوق مطالعہ کی تشنگی بجھاتے ہیں وہ اس ناول میں خوش انجام صورت حال کے بہت سے پہلو دریافت کریں گے جس میں عمر، مزاج اور ذہنی رجحانات کی کوئی قید نہیں ہوگی۔ جن دانش وروں نے ٹولسٹوئی کے تخلیقی فلسفے کو سمجھنے کی کوشش کی اُن کی رائے میں ٹولسٹوئی کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ زندگی کو احترام اور انسان کو وقار کی مسند پر دیکھنا چاہتا ہے۔ ٹولسٹوئی نے اپنے عہد کے مسائل کو جس گہرائی اور بے دار شعور کے ساتھ سمجھا ہے، اُس نے ''آننا کارینینا'' ناول کو وہ مقام عطا کیا جو لازوال ہے۔ ایک بار ٹولسٹوئی نے خود کلامی کے عالم میں کہا تھا، اگر کوئی مجھ سے یہ کہے کہ آج کے بیس پچیس سال بعد کی نسل کے لوگ میری تحریر پڑھیں گے تو وہ ہنسیں گے بھی روئیں گے بھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ زندگی

سے محبت کا رشتہ استوار کریں گے اگر ایسا ہوگا تو میں اپنی تمام تر فکری اور قلمی توانائیاں لکھنے پر ہی صرف کردوں گا۔ ٹولسٹوئی نے تو بیس پچیس سال کہے تھے، لیکن نئی نسلیں تو ایک صدی سے اُس کی تحریریں خصوصاً ''اینا کیرینینا'' اور "War and Peace" پڑھ رہی ہیں، آئندہ نسلیں بھی اُسے پڑھیں گی اور تعریف و تحسین کریں گی اور ٹولسٹوئی کو خراجِ تحسین پیش کریں گی اور ان کے دلوں میں صدیوں قدیم حالات کا جو نقش اُبھرے گا وہ بھی صدیوں تک قائم رہے گا۔

ٹولسٹوئی کی تحریر ایک آئینے کے مانند ہیں جس میں اُس کے اپنے عہد کا روحانی، اخلاقی، معاشرتی بحران جان دار عکس کی صورت موجود ہے۔ اس میں ایک چہرہ ''اینا کیرینینا'' کا بھی ہے جس نے انیسویں صدی کے روس کی اخلاقی قدریں جو کلیسا کی محرابوں سے تقدس کی سند حاصل کر کے نکلتی تھیں اُن کی سچائیوں سے ہم کنار کرنے اور کھرے عمل کے ساتھ سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ حقیقت تو یہ ہے عالمی فکشن کو ٹولسٹوئی نے نیا چہرہ اور نیا پیکر عطا کیا جس کی نمایاں مثالیں ''آنا کارینینا'' اور "War and Peace" ہیں۔ اِن ناولوں نے روحانی ارتقا اور پیکر تراشی کے بہت سے راستے کھول دیئے۔ ٹولسٹوئی کے بارے میں روس کے عظیم مصنف میکسم گورکی نے کہا ہے۔

تالستائے ایک انسان ہی نہیں ایک مکمل دنیا ہے انھوں نے سچ مچ عظیم الشان کاموں کو انجام دیا ہے۔ انھوں نے انیسویں صدی کی زندگی کو نچوڑ کر ہمارے سامنے پیش کیا ہے وہ بھی نہ صرف اس کی سچائیوں کو بلکہ اس کی تمام تر دھڑکنوں کو بھی۔

ٹالسٹائی اگر انیسویں صدی کے عہد میں ہندوستان (اب ہندو پاکستان) میں ہوتا تو شاید ''آنا کارینینا'' کے کردار کا نام کوئی تحریم ہوتا اور کوئی فرق نہ ہوتا۔ پورا ناول روسی معاشرے کا ہی نہیں، غیر منقسم ہندوستان کے جاگیردارانہ معاشرتی نظام کا آئینہ ہوتا جس میں پاکستان کا آج کا معاشرہ اپنی صورت دیکھ سکتا کیوں کہ یہاں کوئی ٹولسٹوئی جیسا قلم کار پیدا نہیں ہوسکا جو یہاں کے جاگیردارانہ استحصالی اور جبر و ظلم کے معاشرے کی جڑیں اکھاڑ پھینکنے کی بات کرتا اور یہاں کی زرخیز زمین میں ایسی کھیتی کے لہلہانے کی نوید دیتا جس کے پھل اور اناج صرف جاگیردار کا مقدر نہ ہوتے بلکہ ان محنت کشوں کا حق ہوتے جنھوں نے کھیتوں کو اپنے خون پسینے سے سینچا۔ کھیت کی پیداوار کا حق زمین کی ملکیت سے نہیں مزدور کی محنت سے متعین کیا جاتا۔

''روسی ادب'' کے مصنف نے ٹولسٹوئی کی فکر کا تجزیہ روحانی، اخلاقی اور سماجی پہلوؤں

سے کیا ہے۔ ان کی توجہ کا مرکز زیادہ تر یہی جہات رہی ہیں۔ انھوں نے ٹولسٹوئی کی فکر کو پرکھنے کی کامیاب سعی کی ہے مگر انھوں نے ٹولسٹوئی کے ناولوں کو فنی حوالے سے زیادہ باریک بینی اور گہرائی و گیرائی سے جانچنے کی طرف شاید زیادہ توجہ صرف نہیں کی۔ انھوں نے ناول ''آنا کارینینا'' کا تجزیہ روسی اخلاقیاتی وسماجیاتی تناظر اور ٹولسٹوئی کے مذہبی جھکاؤ کو پیش نظر رکھ کر کیا ہے اور زبان کے ثقافتی مضمرات کو جاگیر دارانہ سیاق میں رکھ کر دیکھا ہے جو ٹولسٹوئی کی ذاتی فکر کی (ناول میں) آئینہ داری کرتے ہیں۔ اس ضمن میں روسی ادب کے مصنف لکھتے ہیں۔''

''اس ناول میں زندگی کی وہ وسعت نہیں دکھائی گئی ہے جو کہ ''جنگ اور صلح'' کی امتیازی خصوصیت ہے، اس کا موضوع چند افراد کی زندگیاں ہیں، لیکن تالستائی کی نظر وہی ہے کہ جس نے ''جنگ اور صلح'' کو ناول نویسی کا کرشمہ بنا دیا اور میدان کے محدود ہو جانے سے روشنی جہاں پڑتی ہے تیز پڑتی ہے۔ اس ناول میں سیاست اور تاریخ سے بحث نہیں ہے، اخلاق سے ہے، مگر اس انداز سے کہ نہ تو انجام سے وہ بے تعلقی برتی گئی ہے جو رسم نے حقیقت نگار کے لیے لازمی بنا رکھی ہے اور نہ وہ ناصحانہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے جو تالستائی کی بعد کی تصانیف میں ملتا ہے۔ کسی کی زندگی بگڑتے دکھائی گئی ہے، کسی کی بنتے، کسی کو طبیعت اور عادت نے ایسا سخت کر دیا ہے کہ وہ نہ بگڑ سکتا ہے نہ بن سکتا ہے، کسی کی زندگی بس جینے میں ہے اور اسے اس کا احساس ہی نہیں کہ بگڑنا کیا ہے اور بننا کیا ہے، لیکن صورتیں، سیرتیں، جذبات کے پلٹے، واقعات، تقرمی ہیں۔ سبھی کے بیان کرنے میں تالستائی نے کمال دکھایا ہے اور اس کا اخلاقی حسن کبھی اسے چشم پوشی یا حقیقت کو صاف صاف دکھانے سے پرہیز کرنے پر مجبور نہیں کرتا۔ آخری حصہ باقی ناول کے مقابلے میں بے شک ذرا کم زور ہے، کیوں کہ اس وقت جب یہ لکھا گیا تالستائی پر ایک روحانی کیفیت طاری تھی جس نے اس کی طبیعت کو ناول نویسی سے ہٹا دیا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح سے یہ پاپ کٹے۔ اس آخری حصے کا تعلق دراصل ناول کے قصے سے نہیں ہے بلکہ تالستائی کی اپنی زندگی کے ایک نئے دور سے جو کہ اب شروع ہو گیا تھا۔'' (۲۲)

''آنا اور کارینینا'' کی مرکزی سیرتیں دو ہیں، ایک تو خود آنا اور دوسرے لیون۔ لیون، ٹولسٹوئی کی اپنی سیرت کا عکس ہے، تالستائی نے اسے اپنی طرح بدصورت، جھیپو، بے چین، سوسائٹی اور اس کے معیار سے غیر مطمئن اور ایک بہتر اصولِ زندگی دریافت کرنے کی فکر میں مبتلا دکھایا ہے۔ لیون کی سرگزشت کے بعض موقعے اور

واقعات تالستائی کی اپنی زندگی سے لیے گئے ہیں، تالستائی کی طرح وہ بھی تو ریکوں کے خاندان سے مگر سرکاری ملازمت اور سوسائٹی میں شہرت حاصل کرنے کے حوصلے کو غلط ٹھہرا کر وہ زمینداری اور دیہات سدھار میں لگ جاتا ہے، تالستائی کی طرح وہ بھی تین بہنوں پر ایک ساتھ عاشق ہو جاتا ہے، بڑی بہن ڈولی آنا کارینینا کے بھائی سے بیاہ دی جاتی ہے تو وہ سوچتا ہے کہ منجھلی بہن ہی اس کے لیے زیادہ موزوں ہوگی اور جب یہ بھی ہاتھ سے نکل جاتی ہے تو اسے چھوٹی بہن کٹی سے شادی کرنے کی دُھن ہو جاتی ہے۔ لیون جب کٹی سے پہلی مرتبہ دلی خواہش بیان کرتا ہے تو وہ شادی سے انکار کر دیتی ہے، اس لیے کہ اس وقت ایک خوب صورت، خوش مذاق رئیس، کاؤنٹ ورونسکی سے رشتے کا امکان بہت قوی معلوم ہوتا ہے۔ ورونسکی خود اگرچہ سیر تفریح اور ناچ وغیرہ کی محفلوں میں کٹی سے اپنا خاص تعلق سب پر ظاہر کرتا ہے، لیکن وہ محبت کے ساتھ ازدواجی زندگی کی پابندیوں کو عاید کرنا ضروری نہیں سمجھتا اور کٹی کو مایوسی ہی نہ ہوتی بلکہ شاید ذلت بھی اُٹھانا پڑتی اگر آنا کارینینا کے اچانک نمودار ہونے سے خود ورونسکی کی طبیعت پھر نہ جاتی۔

اینا کیرینینا ایک معزز سرکاری ملازم کی بیوی ہے، خوش اخلاق، ہمدردی رکھنے والی عورت ہے اور خودداری اور بے تکلفی، حیا اور ملنساری کے رنگ اس کی طبیعت میں اس طرح ملے ہیں کہ وہ شائستگی اور بھولے بھالے حسن کا ایک مثالی نمونہ معلوم ہوتی ہے۔ اسے اپنی قسمت سے یا اپنے شوہر سے کوئی شکایت نہیں، پُرسکون گھریلو زندگی اسے دل سے پسند ہے اور اس کے گھر کی رونق ایک بچہ بھی ہے جس سے اسے اتنی محبت ہے جتنی کہ ماں ہی کو ہو سکتی ہے، لیکن انسان کی طبیعت میں بگڑنے کے امکانات اسی طرح موجود رہتے ہیں جیسے کہ تندرست جسم میں بیماریوں کے جراثیم۔ ورونسکی سے ملاقات ہوتی ہے اور تعلقات بڑھتے ہیں تو آنا کی اخلاقی خوبیاں آہستہ آہستہ ماند پڑنے لگتی ہیں۔ ورونسکی کی محبت کے منہ پر سے پردہ ہٹتا ہے تو شہوت کی بھیانک صورت دکھائی دیتی ہے اور یہ شہوت کچھ ایسا منتر مارتی ہے کہ آنا کو اپنے اوپر کوئی اختیار نہیں رہتا، اس کا ضمیر، اس کا اخلاقی حسن بالکل فنا ہو جاتا ہے، اس کے معصوم چہرے پر شہوت کی مہر لگ جاتی ہے اور وہ جدھر جاتی ہے، جہاں بیٹھتی ہے، اسی شہوت کی بو پھیل جاتی ہے۔ اب تو ورونسکی کو جال میں پھنسائے رکھنے کے سوا اس کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں رہتا اور اس کوشش میں اس کی صورت اور سیرت ان بے حیا عورتوں کی سی

ہو جاتی ہے جو مجبوری سے پیٹ پالنے کے لیے نہیں بلکہ طبیعت اور عادت سے مردوں کو پکڑنے کی فکر میں رہتی ہیں۔ وہ رشک میں جلتی، ورونسکی کے چھوڑ بھاگنے کے خوف میں گھلتی رہتی ہے اور اپنی مستقل بے چینی اور درد کا علاج مورفیہ (جوہر افیون) سے کرتی ہے۔ وحشت اور بے چینی آخر کو ایسی شدید ہو جاتی ہے کہ آنا کو اس کی تاب نہیں رہتی اور جب ورونسکی اسے چھوڑ کر ایک فوجی مہم پر چلا جاتا ہے تو وہ ایک مال گاڑی کے نیچے گر کر اپنی جان دے دیتی ہے۔

کسی کی طبیعت اس طرح روگی ہو جائے اور زندگی تباہ ہو تو دوسرے اس کے اثر سے بچے نہیں رہ سکتے۔ لیون، کٹّی اور کٹّی کی بڑی بہن ڈولی، جو آنا کی بھاوج ہے، سب آنا کے بدلتے رنگ کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں، مگر ظاہر ہے سب سے زیادہ دکھ آنا کے شوہر کارینینا اور اس کے لڑکے کو ہوتا ہے جو ماں کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا اور اس کی یاد میں تڑپتا رہتا ہے۔ کارینینا روکھا پھیکا رسم اور قاعدے کی پرستش کرنے والا آدمی ہے، اس کی طبیعت میں ذرا بھی لوچ نہیں اور وہ انسانی ہمدردی اور شرافت جو گمراہوں کو بھی محبت کا مستحق سمجھتی ہے، اس کے قیاس میں نہیں آتی۔ کارینینا پہلے اپنی بیوی کو ایک خاص رسمی اور خشک انداز سے نصیحت کرتا ہے، جس ورونسکی سے اس کا تعلق مشہور ہوتا ہے تو وہ آنا کو گھر میں آنے اور بچے کو دیکھنے کی ممانعت کر دیتا ہے اور اس ضد میں آنا کو طلاق دینے سے انکار کرتا رہتا ہے کہ اگر اسے طلاق مل گئی تو وہ ورونسکی سے نکاح کر لے گی اور اس کی بداخلاقی جیسی عیاں ہونی چاہیے، نہ رہے گی۔ اس معاملے میں اور ہر دوسرے معاملے میں کارینینا کا رویہ منطق اور مروجہ اخلاق کے لحاظ سے بالکل صحیح ہے، لیکن جب سینہ میں آدمی کا دل نہ ہو تو آدمی کی صورت اور ناصح کی منطق کام نہیں آتی۔ دُکھ میں بھی کارینینا کو کوئی ہمدردی حاصل نہیں کر پاتا اور آخر میں جب اس پر ایک طرح کی روحانیت طاری ہوتی ہے تو وہ خاصا مضحک معلوم ہونے لگتا ہے۔

اینا کی زندگی برباد ہوئی تو اس میں قصور کس کا تھا؟ اس معاشرت کا جو اپنے آپ کو ناچ رنگ کی محفلوں سے سنوارتی اور آزاد خیالی کے چرچے سے ذہن اور دماغ کو جلا دیتی ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے اور ہوتا رہتا ہے، لیکن آنا ایسی کمسن اور بھولی نہ تھی کہ بہک جاتی اور اس کے مقابلے میں کٹّی کا معاشرتی عیبوں میں پھنس کر یا کسی کے دھوکے میں آ کر ذلیل اور تباہ ہونا کہیں زیادہ آسان تھا۔ زندگی کا کوئی مقصد نہ ہونا ہزار اخلاقی بیماریوں کی جڑ ہے، مگر عورت کے لیے خود ٹولسٹوئی کے خیال میں بھی اس کے سوا کوئی مقصد نہیں ہو سکتا کہ گھر ہو، شوہر ہو اور اولاد

ہو، تمام چیزیں جو آنا کو حاصل تھیں اور جنھیں وہ حد درجہ عزیز رکھتی تھی۔ پھر ورونسکی نہ دغا باز تھا نہ بدمعاش اس نے آنا کے ساتھ کوئی چال نہیں چلی، اسے کسی دھوکے میں نہیں ڈالا اور اسے آنا سے جو محبت تھی اس سے زیادہ داستانوں میں بیان ہو تو ہو، دنیا میں کم پائی جاتی ہے۔ ٹولسٹوئی نے لیون کے لیے تو ہدایت اور نجات کا سامان اس طرح کیا کہ ایک کسان کے ذریعے اس کے دل میں یہ خیال دیا کہ آدمی کو اپنے واسطے نہیں، خدا کے واسطے زندہ رہنا چاہیے، آنا کا معمہ حل نہیں کیا۔ ہم چاہیں تو اس کی حقیقت نگاری کو عشق مجازی کی پردہ دری سمجھ سکتے ہیں اور عبرت کی ایک تصویر، چاہیں تو اسے درد کی ایک سچی کہانی سمجھ سکتے ہیں جس سے دل پر چوٹ لگتی ہے اور وہ غفلت دور ہو جاتی ہے جو انسانیت کی سب سے مہلک بیماری ہے۔

ٹولسٹوئی نے جب ''اینا کیرینینا'' ختم کیا تو وہ شخصی اخلاق کے معموں کو چھوڑ کر ان بنیادی اصولوں کی تلاش میں نکل گیا تھا کہ جن پر اجتماعی زندگی تعمیر کی جا سکے، اور سچ تو یہ ہے کہ یہی اصول ان شخصی، معموں کو بھی حل کر سکتے ہیں کہ جن پر الگ الگ غور کیجیے تو درد سر اور بے چینی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ٹولسٹوئی حقیقت کی تلاش میں نکلا تو صبر اور استقلال اور ضبط کا وہ سامان جو ایسے لمبے سفر کے لیے درکار ہے اس کے پاس نہ تھا، مگر اس کا شوق ایسا سچا تھا کہ بے سرو سامانی کے باوجود وہ بہت دور پہنچ گیا اور اس میں اتنی ہمت پیدا ہو گئی کہ ہزار دشواریاں اور الجھنیں پھر اسے گھسیٹ کر بلندی سے پستی کی طرف نہ لا سکیں۔ اس کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ علم جو فرد اور جماعت دونوں کی اخلاقی نشوونما کا ذریعہ نہ بن سکے جہالت سے بھی بدتر ہے اور وہ آزاد خیالی جو بصیرت دینے کے بجائے کہ جسے دور کیے بغیر صحیح اخلاق کا تصور قائم کرنا ناممکن ہوگا۔ ''عقیدہ زندگی کی قوت ہے'' انسان بغیر عقیدے کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ گزشتہ زمانے میں انسان کے روحانی شعور نے جس طرح دینی تصورات مرتب کیے اور عقیدے نے زندگی کی پہیلیاں جس طرح بوجھی ہیں اسی میں نوع انسانی کا سب سے گہرا علم پایا جاتا ہے''۔ اس خیال کی تکمیل ایک اور کیفیت نے کر دی۔ ''بہار کا دن تھا اور میں اکیلا جنگل میں بیٹھا خاموشی پر کان لگائے تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ دیکھیے پچھلے تین سال سے بے چین ہوں، خدا کی جستجو ہے، خوشی اور بے زاری کی دو حالتوں کے درمیان جھولتا رہتا ہوں... ایک بارگی مجھے معلوم ہو گیا کہ میں زندہ تب ہی ہوتا ہوں جب مجھے خدا پر یقین ہوتا ہے... میرے گرد ہر چیز جاگ اٹھتی ہے، ہر چیز میں معنی اور مقصد نظر آنے لگتے ہیں... خدا کا جاننا اور زندہ ہونا ایک ہے''۔ (۲۳)

مذہبی جذبے کے اس تسلط نے ایک طرف تو ٹولسٹوئی کو اس پر مجبور کیا کہ وہ اپنے عقیدے صاف صاف بیان کرے جس کے سبب سے اس کی روسی کلیسا سے لڑائی ہوگئی اور دوسری طرف اسے یورپ کے ادیبوں اور فنونِ لطیفہ کے قدر شناسوں سے بھڑا دیا۔ ٹولسٹوئی انجیل کا مطالعہ، ماحول کا مشاہدہ اور اپنے دل سے جرح کرتے کرتے اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ حضرت عیسیٰؑ نے اخوت، عدم تشدد، ایثار اور سلجھی ہوئی پاکیزہ محنت مشقت کی زندگی کی تعلیم دی تھی، کلیسائی نظام، اس کا ٹھاٹھ، اس کی عبادت اور رسمیں بعد کے تصرفات ہیں جنھوں نے اصل تعلیم کی صورت بگاڑ دی۔ ادھر ان لوگوں کے جواب میں جن کا خیال تھا کہ مذہب اور تہذیب کا ساتھ نہیں ہوسکتا، اور انسان اگر تہذیب کو چھوڑ دے تو ترقی کے تمام رستے بند ہو جاتے ہیں ٹولسٹوئی نے کہا کہ مذہب اور عقیدہ اگرچہ اس محدود علمی عقل کے لیے مہلک ہے جو جزو کو کل اور حیوانی زندگی کو اصل زندگی ٹھیراتی ہے لیکن وہ اس سچی عقل کی روشنی پھیلاتا ہے جو کائنات کے اندر مضمر ہے اور جس سے انسان کو بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ یہ عقل، عمل چاہتی ہے، اس کا عمل، عشق ہے، جو انسان کو بے خودی سکھاتا ہے اور اپنی ذات کو جس کی کوئی وقعت نہیں اس لیے کہ انسان کو اس پر اختیار نہیں، قربان کر کے ایک غیر محدود، دائمی زندگی کی دعوت دیتا ہے۔

اس وقت سے ٹولسٹوئی، سرکاری کلیسا اور ''روشن خیال'' طبقے کے درمیان جو جنگ چھڑی وہ ٹولسٹوئی کے مرتے دم تک جاری رہی۔ ہم یہاں پر مذہبی بحث میں حصہ نہیں لے سکتے، اگرچہ یہ موضوع بہت دل چسپ ہے اور ایک زمانے میں ٹولسٹوئی کے جوش اور اس کے قلم کے زور نے سارے یورپ کو اس میں اُلجھا دیا تھا۔ ادب اور فن کے معیار پر جو بحث ٹولسٹوئی نے چھیڑی وہ بھی کچھ کم دل چسپ اور بصیرت افروز نہیں، لیکن اسے مفصل بیان کرنے کے لیے ایک پوری کتاب لکھی جائے تو بھی شاید کافی نہ ہوگی۔ ٹولسٹوئی اب تک تو ادب اور انسانیت کی خدمت کا مقابلہ کرتا رہا تھا اور ادب کے خلاف جو کچھ کہا تھا اس کا مقصد ادیبوں کو حقیقت شناسی کی طرف مائل کرنا تھا۔

ٹولسٹوئی نے پہلے غریب واڑوں کی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے اور پھر اس کے اسباب پر بحث کر کے نتیجے نکالے ہیں جو صحیح تسلیم کر لیے جائیں اور ہدایت کا ذریعہ بنائے جائیں تو مذہبی، سیاسی اور معاشی نظام، علم، ادب، فن سب ہی کو مٹانا اور مٹا کر نئے سرے سے قائم کرنا لازمی ہو جاتا ہے لیکن ٹولسٹوئی کی بحث علمی اور عقلی نہیں ہے، اس نے ریاست کے ظلم، دولت مندوں کی خود غرضی اور علم اور تہذیب کے دھوکوں کے خلاف اعلان

جنگ کیا ہے اور اس کی تلقین کی ہے کہ ظالموں اور گمراہ کرنے والوں سے قطع تعلق کیا جائے، غریبوں کی محنت سے فائدہ اُٹھانا، ریاست کی خدمت کرنا بند کر دیا جائے، جسمانی محنت کو ایک اخلاقی فرض مانا جائے اور عدم تشدد کے ذریعے سے ان تمام قوتوں کا مقابلہ کیا جائے جو سماجی زندگی میں ظلم اور خود غرضی پیدا کرتی ہیں اور قائم رکھتی ہیں۔ عدم تشدد کی تعلیم حضرت عیسیٰؑ نے دی ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کو ظلم کا مقابلہ ظلم سے نہیں بلکہ ایثار سے کرنا چاہیے اور دنیا کا سارا دُکھ درد اپنے اوپر لے کر اپنی زندگی کو مجسمہ صبر، محبت اور بے خودی بنا دینا چاہیے۔ یہ تعلیم ایسی ہے کہ اس پر عمل کرنے والا ہو تو یہ نہایت دل افروز اور ہمت افزا بن سکتی ہے، لیکن اگر یہ باتوں اور بحثوں تک محدود رہے اور اس پر عمل کرنے والا بڑے پائے کی شخصیت نہ رکھتا ہو تو اس کا اثر بالکل الٹا ہوتا ہے اور لوگ متاثر ہونے کے بجائے محبت، صبر اور ایثار جیسے قابل قدر جذبات کی ہنسی اُڑانے لگتے ہیں۔ ٹولسٹوئی کی شخصیت ناہم وار تھی، اس کا جوش زائد بھاپ کی طرح زبان اور قلم کے رستے سے نکل جایا کرتا تھا اور عمل کا وقت آتا تو وہ ایسی پس وپیش میں پڑ جاتا کہ جو اس کو مثل اور اس کے معتقدوں کو حیران کر دیتی تھی۔ ادب کے عام قاری نے ہی ٹولسٹوئی کے ناولوں کا مطالعہ نہیں کیا بلکہ عالمی سطح کے ناول نگاروں میں ڈی۔ ایچ۔ لارنس جیسے بڑے ناول نگار نے بھی ٹولسٹوئی کا مطالعہ کیا، نہ صرف مطالعہ کیا بلکہ اپنا تنقیدی Point of View بھی پیش کیا۔

ڈی۔ ایچ۔ لارنس انگریزی ادب میں شاعر، انشائیہ نگار اور ناول نویس کے طور پر تو جانے ہی جاتے ہیں لیکن ان کا ایک اور حوالہ فکشن کے بہت عمدہ ناقد کا بھی ہے۔ ڈی۔ ایچ لارنس نے ٹولسٹوئی کے ناولوں کا نہایت گہرائی و گیرائی سے نہ صرف مطالعہ کیا بلکہ ٹولسٹوئی کے ناولوں پر تنقید کر کے اپنی ناقدانہ بصیرت کا بھی ثبوت دیا ہے۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس نے نہایت باریک بینی سے ٹولسٹوئی کے ناولوں پر اپنے ناقدانہ تجزیے، فنی وفکری حوالے سے پیش کیے ہیں۔

ڈی۔ ایچ۔ لارنس نے جس طرح اپنے ناولوں میں کمال چابکدستی اور عدیم النظیر مہارت سے تجزیات نگاری سے کام لیا ہے، اسی طرح انھوں نے ٹولسٹوئی کے ناولوں میں تجزیات نگاری میں فنکارانہ کمزوریوں پر بھی کڑی گرفت کی ہے۔ اس خوبی میں انھیں کمال حاصل ہے۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس نے متعدد ناول لکھ کر جس طرح ناول کو آرٹ کے درجے پر فائز کیے رکھا، اسی طرح وہ ناول کو مسیحی اشتراکیت اور مذہب وعقیدے سے بیدار رکھنے کے نظریے کے قائل ہیں یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ٹولسٹوئی کے ناولوں پر فنی حوالے سے کڑی

گرفت کی ہے:

ڈی۔ ایچ۔ لارنس کو یہ اساطیری علامات اور ان ہی کے اندر مضمر ایک مابعد الطبیعیاتی نظام جس طرح یونانی المیہ نگاروں میں اور شیکسپیئر کے یہاں نظر آتا ہے، اسی طرح ہارڈی کے یہاں، ایملی برونٹی کے یہاں، ٹولسٹوئی کے یہاں، بلکہ امریکہ کے کلاسیکی، ناول نگاروں میں ہاتھورن اور ہرمن میلول کے یہاں بھی دکھائی دیتا ہے۔ کہیں کم، کہیں زیادہ، کہیں زیادہ شعور و احساس کے توافق کے ساتھ، کہیں دونوں کے مابین ایک تصادم کی صورت میں... المیہ ہیرو تو ہمیشہ سے ایک نہایت قابلِ تقلید مثال کی طرح زندہ رہتا ہے، چاہے شہید ہو جائے یا بظاہر بے اثر بنا دیا جائے۔

کسی بھی ناقد کا اصل کمال (''چاہے وہ لیوس کے الفاظ میں عصر حاضر کا عمدہ ترین ناقد'' (۲۳) ہی کیوں نہ ہو) اس چیز میں ہوتا ہے جسے اس کا تنقیدی عمل کھیپے اور جس میں اس کی ادبی ترجیحات، اس کی محبتیں اور نفرتیں اور ان کو ہمارے لیے ایک مفصل اور مسلسل تجزیاتی مطالعے کے ذریعے قابل قبول بنانا شامل ہوتا ہے اور حیران کن بات تو یہ ہے کہ لارنس نے یورپ اور روس کی ادبیات، انگلستان اور امریکہ کے کلاسیکی، ادب بلکہ اپنے معاصرین تک کے سلسلے میں کس قدر کم غلطیاں کی ہیں اور اگر فکشن کے دو بڑے فنکاروں ... فلوبیئر اور ٹولسٹوئی... کی نسبت اس میں ایک چڑ سی پائی جاتی ہے، تو بھی وہ ان کے فنی کمال کا کبھی منکر نہیں ہوتا، ان کی مابعد الطبیعیات کو مستحکم نہیں سمجھتا اور کم سے کم ٹولسٹوئی کے سلسلے میں اس کا رویہ ایسا ہے کہ ایف۔ آر۔ لیوس کو پہلی بار ایک غیر ملکی کتاب 'اینا کارینینا'' پر ایک مقالہ لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی جس کے ذریعے لارنس کی خطاؤں کی تلافی بھی کی جا سکے اور ان کی تاویل بھی۔ (فلوبیئر کے سلسلے میں ایسا کرنے کی خواہش اس لیے پیدا نہ ہوئی کہ یہاں لیوس، لارنس کی تائید کرتا ہے۔)

بہر حال ٹولسٹوئی کے سلسلے میں لارنس کی فرد جرم، تین شقوں پر مشتمل ہے۔

ا۔ ''جب ورونسکی، اینا کو پالیتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ طمانیت محسوس نہ کرے، پھر یہ کیوں نہ ممکن ہوا کہ دونوں مل کر اپنی ایک الگ دنیا بسا لیتے اور اونچی سوسائٹی کے مقاطعے سے مرعوب نہ ہوتے۔ انھیں چاہیے تھا کہ اوپیرا ہاؤس میں جب ''اشرافیہ'' نے ان کو دیکھ کر پیٹھ موڑ لی تھی تو ان کی پیٹھ کو، ان کے چہرے سے بہتر سمجھتے (گویا کہ ورونسکی اور اینا پر، بقول لیوس، اصل اعتراض یہ ہے کہ انھوں نے خود لارنس اور فریڈا کی طرح عمل کیوں نہ کیا، اور رائے عامہ سے دب کر کیوں رہ گئے؟ یعنی یہاں کسی، جلد بازی یا بے صبری'' کا قصہ نہیں، زندگی کا بھر کا معاملہ ہے۔)

[جاری ہے۔]

غزل غزل سرگرمِ سفر شاعر... جلیل عالی

کھولے وہ عرضِ حال نے امکاں غزل غزل
چشمِ ہنر بھی رہ گئی حیراں غزل غزل
خود لفظ بولتے ہیں سخن کس قلم کے ہیں
اک فیضِ منفرد ہے فروزاں غزل غزل

.....

غزل ایک ایسی صنفِ سخن ہے جسے ہر دور کے شعرا نے محبوب رکھا، کیونکہ غزل ہر موسم میں سرسبز شاداب رہی اور حُسنِ سخن اور جانِ سخن کی حیثیت سے اردو ادب میں اپنا مقام بنانے میں کامیاب نظر آئی۔ مطلب یہ کہ غزل کا شاعر صرف وہی بیان کرتا ہے جو اس کے دل پر بیتی ہو۔ شاعر کے دل پر گزرنے والی کیفیات وہی ہوتی ہیں جو دوسروں پر بھی بیت چکی ہوتی ہیں۔ لہٰذا پڑھنے والے یا سننے والے کو غزل میں اپنی داستان سنائی دیتی ہے۔ ڈاکٹر وقار احمد رضوی فرماتے ہیں کہ ''غزل ایک ساز کی طرح ہے، اُس کا ہر شعر ایک تار ہے۔ ہر تار کی آواز مختلف ہے، مگر ان آوازوں کے امتزاج سے ایک ایسا دل نواز نغمہ ترتیب پاتا ہے جو ساز و آواز سے ہم آہنگ ہو کر فضا میں گلاب بکھیر دیتا ہے۔'' جلیل عالی موجودہ عہد کے معتبر، صاحبِ اسلوب، کہنہ مشق شاعر، نقاد، ایجوکیشنسٹ، سوشیالوجسٹ اور اقبال شناس ادیب ہیں۔ جن کی غزل درحقیقت جذبات کا مرقع ہے، ان کے گلزارِ سخن میں موضوع کے

صدام ساگر

اعتبار سے مختلف قسم کے پھول کھلتے ہیں اور فکر و خیال کی صورت میں ان پھولوں کی خوشبو دنیائے ادب کو معطر کرتی نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری میں کئی طرح کے خیالات مختلف صورتوں میں پڑھنے کو ملتے ہیں۔

دن ہیں ہمارے اور سے راتیں ہیں مختلف
سو اپنی شاعری میں بھی باتیں ہیں مختلف

.....

موجودہ عہد کے جن تخلیق کاروں کو ہر سطح پر پزیرائی ملی اُن میں جلیل عالی کا نام بھی نمایاں ہیں۔ ان کی غزلیں پڑھ کر یہ بات واضح محسوس ہوتی ہے کہ خالق نے انہیں عمدہ شاعر اور ادیب کے طور پر تخلیق کیا ہے۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز دسویں جماعت کی الوداعی تقریب کے لیے ایک نظم لکھنے سے ہُوا۔ طویل عرصے تک ادب کی آبیاری کرنے والے جلیل عالی نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ شاعری کی نذر کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب ان کی شاعری میں جو نکھار پیدا ہو گیا ہے اور ان کے کلام میں جو تازہ کاری آ گئی ہے وہ ان کے تلخ و شیریں تجربات کی ہنرمندی اور شاعرانہ فن کاری سے ہیں جو بہت کم شعرا کے کلام میں نظر آتی ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ انہیں اپنے دل کی بات اشعار میں کہنے کا فن بہ خوبی آتا ہے اور اس اعتبار سے ان کی شاعری خاصی پختہ ہو چکی ہے۔

ان کا پہلا شعری مجموعہ ''خواب دریچہ'' کے نام سے 1984 کو منظرِ عام پر آیا۔ ان کی دیگر تصانیف میں ''شوق ستارہ''، ''عرضِ ہنر سے آگے''، ''لفظ مختصر سے مرے (انتخاب جلیل عالی، از خاور اعجاز)''، ''نور نہایا رستہ (مجموعہ نعت)''، ''شعری دانش کی دُھن میں (تنقیدی مضامین)'' اور ''قلبیہ (نظمیں)'' شامل ہیں۔ ان کی شخصیت اور فن کا اعتراف کرتے ہوئے اکادمی ادبیات پاکستان نے ''پاکستانی ادب کے معمار'' سیریز کا اہتمام بھی کیا جو خاور اعجاز کی علمی و تحقیقی کاوشوں کا نتیجہ ہے، یقیناً یہ کتاب عالی صاحب کی شخصیت اور فن کو سمجھنے میں ایک بنیادی وسیلے کی حیثیت رکھتی ہے۔ عالی صاحب کی عمر کا بڑا حصہ تدریس کے شعبہ سے وابستگی میں گزرا۔

میرے سامنے زیرِ نظر ان کا نیا شعری مجموعہ ''ایک لہر ایسی بھی'' موجود ہے، جو ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی سمیٹ رہا ہے۔ یہ مجموعہ ان کی غزلوں پر مشتمل ہیں، جس کے آغاز میں ایک حمد اور دو نعتیہ کلام بھی شامل کیے گئے ہیں۔ ان کا یہ شعری مجموعہ تیرہ برس کے ایک طویل عرصے کی ریاضتوں کا حاصل ہے جس میں 2008

سے 2023 تک کا کلام شامل کیا گیا ہے۔ جس کے پیش لفظ میں محمد حمید شاہد رقم طراز ہے کہ ''یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہم جس شاعر کا مطالعہ کرنے جا رہے ہیں وہ نرے شاعر نہیں ہیں، ایک فکر سے وابستہ اور سوچتے ہوئے ذہن والے شاعر ہیں۔ شعری روایت سے جڑے ہوئے اور اس میں کچھ ایزاد کرنے کی تاہنگ رکھنے والے شاعر ہیں، ہمہ دم مضطرب اور تخلیقی عمل میں اپنی پوری شخصیت کی تظہیر کرنے والے شاعر۔ یہیں سے جلیل عالی اپنے ہم عصروں سے مختلف اور ممتاز ہوتے ہیں، ان کا انہی سے خاص اسلوب ڈھلتا ہے اور ان کی شاعری محض شاعری نہیں رہتی عملِ خیر اور حدیثِ بصیرت ہو جاتی ہے۔''

جلیل عالی کی وجہِ شہرت غزل گوئی ہے، جبکہ ان کی محبوب صنفِ سخن حمد و نعت ہے۔ وہ حمد کے اشعار میں خالقِ دو جہاں کی تمام تر رحمتوں اور نعمتوں کا بڑی خوبصورتی کے ساتھ ذکر کچھ اس طرح سے کرتے ہیں کہ:

کوئی حلقہ ہے نہ حد ہے نہ کنارے اُس کے
فرش و افلاک، فضا، چاند ستارے اُس کے
آنکھ کے بس میں کہاں عکس اُتارے اُس کے
دلِ بینا ہی سمجھتا ہے اشارے اُس کے

.....

نعتیہ شاعری کی بنیاد ذاتِ مصطفیٰؐ سے محبت و عقیدت کا جذبہ ہے۔ یہی جذبہ ہمیں جلیل عالی کی نعت کے اشعار میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آبِ بقا کے نہیں جامِ کوثر کے تمنائی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں مکہ اور مدینہ بسا ہُوا ہے۔ ان کا دل ہر گھڑی طوافِ کعبہ اور گنبدِ خضریٰ کی زیارت کے لیے دھڑکتا بھی ہے اور تڑپتا بھی۔ ان کی محبت و عقیدت کو سمجھنے کے لیے یہ اشعار کافی ہوں گے۔

دوسرا کون ہے اس شان کا ممدوح کوئی
وصف جیسے سرِ قرطاس و قلم تیرےؐ ہیں
کیا مجال آنکھ اٹھے اپنی کسی اور طرف
آخری سانس تلک تیریؐ قسم تیرےؐ ہیں

.....

جلیل عالی کے اس نعتیہ اسلوب کو دیکھتے ہوئے شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ کا یہ شعر یاد آتا ہے کہ:

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

.....

علامہ اقبالؒ اور میر تقی میرؔ کے حوالے سے عالی صاحب کی عقیدت بھی ان کی نثری و شعری تخلیقات میں نمایاں ہے۔ بقول محمد حمید شاہد کہ ''جلیل عالی کی تخلیقی شخصیت کو

اُسار نے میں اقبال کا حوالہ بھی بہت اہم ہے۔ زبان کی سطح پر کم کم اور فکری سطح پر بہت بہت زیادہ۔ یہی سبب ہے کہ اقبال کے سلسلے سے جڑ کر بھی ان کی شعری فضا الگ مزاج بناتی ہے۔ اس باب میں میرو غالب کی طرف دیکھتے ہیں۔ اگرچہ انہیں اقبال کے ہاں لسانی قلبِ ماہیت بھی مل جاتی ہے مگر وہ زبان سازی کے عمل میں اپنا الگ لحن اور مزاج بناتے نظر آتے ہیں۔''

سخن کو سوچتے ہو کیسے انگ عالی
کہیں اقبالتے ہو اور کہیں پر میرتے ہو

....

کدھر وہ عقل وجنوں میں اقبال سا توازن
کہاں طلبگارِ غم کوئی مثلِ میر انساں

....

''ایک لہر ایسی بھی'' اس شعری مجموعہ میں عالی صاحب نے نئی نئی زمینیں بھی استعمال کی ہیں اور نئی نئی ردیفیں بھی۔ کیونکہ اچھوتے قافیے اور ردیفیں حُسنِ شاعری میں تازگی پیدا کرتے ہیں اور نئی سے نئی بات کہنے کا راستہ دکھاتے ہیں۔ جلیل عالی اپنی حمد و نعت اور غزلیات میں بعض اوقات ایسے شاندار قافیے اور ردیفیں برتتے ہیں کہ جس سے ان کی تخلیقی زرخیزی نکھر کا سامنے آتی ہے۔ نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

جاں کھپاتے ہیں غمِ عشق میں خوش خوش عالی
کیسی لذت کا یہ آزار بنایا ہوا ہے

....

کون سی شے کی کمی ہے مرے پاکستاں میں
کیوں اسے چھوڑ سمرقند و بخارا جاؤں

....

کب ہُوا کہ دنیا کی بات مان کر جائیں
دل جدھر کہے عالی ہم تو بس اُدھر جائیں

....

غزل غزل سرگرمِ سفر شاعر جلیل عالی کی بعض لمبی بحروں والی غزلیں جن میں زبان اور اندازِ بیان دونوں گفتاری ہیں ان کی خوش گفتاری کا آئینہ دار ان کا شعری مجموعہ ''ایک لہر ایسی بھی'' ہیں۔ اس شعری مجموعہ میں شامل تمام غزلوں کی خوبی یہ ہے کہ ان میں گفتگو کا انداز پایا جاتا ہے۔ آخر میں اتنا ہی کہوں گا کہ جلیل عالی کے درجنوں مصرعے اور شعر نہ صرف دلوں میں بلکہ روح میں اُتر جانے اور زبان زدِ عام ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ایک لہر ایسی بھی بحرِ بے کرانی کی
مستیِ معانی کی زد میں تہ بہ تہ جائیں

☆☆☆☆☆

اعجاز رضوی منفرد شاعر اور باکمال شخصیت

کہاں کہاں سے زمین کھودوں
کہاں کہاں سے فلک کریدوں
کہاں کہاں سے پہاڑ کاٹوں
کہاں سے دریا کے رُخ کو موڑوں
کہاں سمندر کی راہ روکوں
کہاں سے صحرا کو راستہ دوں

مجھے بتانا، مجھے بتانا، کہاں چھپا ہے مرا ستارا مجھے بتانا
میرے ستارے کی رہگزر میں، نشیب کیوں ہے، مجھے بتانا
مرے ستارے کے اپنے گھر میں، فریب کیوں ہے

.....

اتنا خوبصورت اور اچھوتا کلام کسی اور کا نہیں ہے بلکہ ہمارے دلوں کے قریب بلکہ دلوں کے اندر بسنے والے اور دھڑکنے والے شاعر ادیب اور دانشور اعجاز رضوی کا ہے۔ جس کو سن کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ لفظوں کی جادوگری کسے کہتے ہیں اور الفاظ کے جادو سے دلوں میں اُترنا بلکہ سما جانا اُن کا محبوب مشغلہ ہے۔

اعجاز رضوی ایک ایسی سحر انگیز شخصیت ہیں جن سے آپ کی شناسائی اور دوستی آج کل کے متعصب اور گھٹن زدہ ماحول میں کسی نعمت غیر مترکبہ اور بادِ صبا کے جھونکے سے ہرگز کم نہیں ہے اعجاز رضوی ایسی باغ و بہار ہستی کے مالک ہیں کہ ان کی طرف سے آپ کو صرف ٹھنڈی اور خوشبودار مہکتی ہوئی ہوائیں ہی آسکتی ہیں۔ یہ کدورت، تنگ نظری اور بغض و کینہ جیسی خصوصیات سے قطعاً عاری ہیں اور ان جملہ اوصاف سے کوسوں دُور ہی رہنا پسند کرتے ہیں یہ انتہائی شفیق اور ملنسار انسان ہیں عاجزی انکساری اور بردباری ان کی شخصیت کا خاصا ہے لیکن یہ اپنی خودداری پر بھی کوئی سمجھوتہ کرنے پر تیار نہیں ہوتے یہی وجہ ہے کہ یہ اپنے ہم عصروں میں ممتاز و ممیز نظر آتے ہیں۔ اعجاز رضوی بلند پایہ شاعر، بے مثال خاکہ نگار، منفرد سکرپٹ رائٹر اور کمال کے اینکر پرسن ہیں۔ ان کی ہر صنفِ ادب پر گرفت ان کی ادب سے لگن فنی مہارت اور سنجیدگی کی غماز ہے۔ یہ حقیقی طور پر اپنے تن من اور دھن سے پچھلی کئی دہائیوں سے شعر و ادب کی خدمت کے لیے کوشاں ہیں چاہے ''فنون'' میں احمد ندیم قاسمی صاحب کا ساتھ ہو یا حلقہ ارباب ذوق میں شعر و ادب کے لیے ان کی کاوشیں ہوں ہر جگہ پر ان کا کردار واضح اور شفاف نظر آتا ہے۔ ''فنون'' میں وہ جس طرح وہ قاسمی صاحب کے ساتھ اور قریب تھے وہاں

فیصل زمان چشتی

بہت سے مادی فوائد حاصل کر سکتے تھے لیکن انھوں نے کبھی بھی اپنے اُصولوں پر سودے بازی نہیں کی اور ان کا وہ تمام دور انیہ آئینے کی طرح صاف اور شفاف ہے۔ حلقہ ارباب ذوق میں جوائنٹ سیکرٹری سے لے کر حلقہ کی صدارت تک کے سفر میں ہر جگہ پر وہ پوری دیانتداری اور پورے قد کے ساتھ ہمیشہ کھڑے رہے اور ڈٹے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی حلقوں میں ان کا نام نہایت عزت و تکریم کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ وہ اصول پرست آدمی ہیں جس پر وہ ذرا بھی لچک نہیں دکھاتے منافقت سے اُن کا دور سے بھی واسطہ نہیں ہے۔ انھوں نے ہمیشہ سچ اور حق کا ساتھ دیا اور کبھی مصلحت کوشی سے کام نہیں لیا۔ اپنے موقف کو بیان کرنے میں یہ کبھی نہیں گھبراتے اور بلاخوف و خطر نہایت جرأت اور دلیری سے بات کر جاتے ہیں آج کل کے دور میں یہ ہمت و استقلال ہر شخص کے نصیب میں نہیں اور یہ قلمی و علمی خصوصیات ناپید ہوتی جا رہی ہیں۔

اعجاز رضوی انتہائی حساس اور خوبصورت شاعر ہیں۔ جو نعت، منقبت اور نظم غرضیکہ ہر صنف ادب میں شاعری کرتے ہیں اور کمال کرتے ہیں۔ نظم ان کا خاص میدان ہے اور یہ اس میدان کے شہسوار ہیں۔ ان کی نظمیں کسی بھی معیار پر پرکھی جا سکتی ہیں ان کی نظموں میں ایک خاص کیفیت اور سرشاری ہوتی ہے۔ یہ نظم برائے نظم نہیں کہتے بلکہ یہ نظم برائے زندگی کہتے ہیں ان کی نظم کی پنچ لائن اتنی خوبصورت اور دل میں اُترنے والی ہوتی ہے کہ قاری بڑی دیر تک اس کے سحر سے نکل نہیں پاتا۔ یہ حقیقت میں جدید تر شاعر ہیں ان کی شاعری سُن کر شاعری کو کارِ زیاں سمجھنے والا بھی شاعری پر ایمان لے آتا ہے اور یہی ان کی شاعری کا معجزہ ہے اور کامیابی ہے ان کی ایک چھوٹی سی نظم ملاحظہ کیجیے تا کہ میرے دعوے کی آپ بھی تصدیق کر سکیں:

سنو / جلدی کرو / زادِ سفر باندھو / زمیں کا آخری چکر مکمل ہونے والا ہے / زمیں تھک ہار کے اب بیٹھ جائے گی / ہمیں اگلے زمانے کی کسی اگلی کہانی میں نئے کردار کرنے ہیں / نئے بہروپ بھرنے ہیں / سنو / جلدی کرو / زادِ سفر باندھو / زمیں کا آخری چکر مکمل ہونے والا ہے

.....

اعجاز رضوی نظم میں بات کرتے ہوئے کبھی دیومالائی کہانیوں اور طلسماتی کرداروں کا سہارا نہیں لیتے نا ہی مشکل الفاظ سے قاری پر رعب ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ نہایت خلوص و سادگی اور سہل پسندی سے کام لیتے ہوئے خوبصورت تشبیہات و استعارات اور چمکتی ہوئی تلمیحات کے ساتھ قاری کو اپنی بات اتنی عمدگی سے سمجھاتے ہیں کہ وہ ان کی شاعری کے طلسم کے حصار میں جکڑا جاتا ہے۔ ان کی نظمیں وہ ان دیکھا کرشماتی جہان ہے جہاں کوئی جب داخل ہو جائے تو اس کا دل اس سے واپس آنے کو نہیں چاہتا یہی وجہ ہے کہ جب ہم ان سے شاعری سنتے ہیں تو سنتے ہی چلے جاتے ہیں۔ ایک اور نظم دیکھیے اور سر دھنیے:

مری ہتھیلی پہ ہجر و وصال خاک ہوئے
میں ان کی خاک اُڑادوں کے اپنے منہ پہ ملوں
کسی طرف سے اشارا کوئی نہیں ملتا
کوئی بھی آنکھ مجھے غور سے نہیں دیکھتی
کوئی بھی دل مری خاطر یہاں دھڑکتا نہیں
یہاں تو شہر کی ترتیب ہی نرالی ہے
جو لوگ ہجر فروشی میں تاک تھے پہلے
وہ لوگ وصل کی اجرک اُٹھائے پھرتے ہیں
میں اُن سے وصل خریدوں یا ہجر کی ماچس
مرے لیے تو برابر ہے یہ خریداری
عجیب رنگ پہ آئی ہے کرم بازاری
کوئی بھی پھڑیا کسی اور کی نہیں سنتا
بس اپنے مال کی تعریف کرتا جاتا ہے
میں دل شکستہ کھڑا چاروں سمت دیکھتا ہوں
کسی طرف سے اشارا کوئی نہیں ملتا
میں سر بہ زانو پڑا بڑبڑاتا رہتا ہوں
مجھے یہ گرمی بازار مار جائے گی
مجھے یہ تاجری گفتار مار جائے گی

.....

اعجاز رضوی پی ٹی وی سمیت پاکستان کے بڑے چینلز کے سکرپٹ رائٹر رہے ہیں اور کئی معروف پروگرامز کو اپنے زورِ قلم سے کامیابی کے سہرے بندھوا چکے ہیں جو ان کی ادبی اور فنی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اعجاز رضوی عرصۂ دراز سے عہدِ حاضر کے سب سے موقر ادبی جریدے "ماہنامہ بیاض" سے منسلک ہیں۔ اور وہاں پر بھی اپنا کلیدی کردار ادا کر رہے ہیں اور یہ ماہنامہ ادبی دنیا میں اپنی ایک شناخت رکھتا ہے۔ شعر ادب کے لیے اس جریدے کی خدمات قابلِ تحسین اور ناقابلِ فراموش ہیں۔ اگر کسی ایونٹ یا مشاعرے کی نظامت اعجاز رضوی کر رہے ہوں تو ان کا نام ہی اس پروگرام کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا ہے کیونکہ ان کے فی البدیہہ اور خوبصورت بے ساختہ رنگ دار اور برمحل جملے محفل کا رنگ جمانے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔

اعجاز رضوی انتہائی اعلیٰ پائے کے خاکہ نگار ہیں اور ان کا شمار عہدِ موجود کے اہم ترین خاکہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ خاکہ لکھنا انتہائی اہم اور حساس صنفِ ادب ہے اس میں لوگوں کے ناراض ہونے کی فکر بھی دامن گیر رہتی ہے۔ نظم کے ساتھ ساتھ ان کی نثر میں بھی بلا کی کاٹ اور تاثیر ہے ان کے الفاظ اور فقرات انتہائی خوبصورت اور نپے تلے ہوتے ہیں ان میں اپنائیت کی چاشنی اور محبت کی حلاوت ہوتی ہے جس سے وہ کردار کا ایسا نقشہ کھینچتے ہیں کہ قاری دم بخود رہ جاتا ہے یہ کسی کردار کے منفی پہلو کو اس طرح اُجاگر کرتے ہیں کہ وہ خوبی نظر آنے لگتی ہے۔

اعجاز رضوی چھ عدد کتابوں کے مصنف ہیں جن میں چار شاعری کی اور دو خاکوں کے مجموعے ہیں، جن میں سفر واجب ہوا، بہت سے دکھ ہیں، خوف اور اُداسی کی نظمیں، مجھ سے کون بچھڑا ہے شاعری کی ہیں "کلوزاپ" اور "بندہ بشر" خاکوں پر مشتمل ہیں۔ ان کی پوری زندگی دنیائے ادب کے نامور اور قبول ترین لوگوں کے ساتھ گزری ہے مگر کبھی بھی اپنی ذات کے فائدے کے لیے کسی کو کہا اور نہ کبھی کوئی نام استعمال کیا۔ یہ نمود و نمائش، ذاتی تشہیر اور سستی شہرت کے حصول کے قائل نہیں ہیں بلکہ مسلسل اور انتھک محنت ہی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔

ایک سچا اور کھرا شاعر ہمیشہ حساس اور دردمند دل رکھنے والا ہوتا ہے۔ وہ ناہموار معاشرتی رویوں اور اردگرد پھیلنے والی بے چینی سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ وہ ہر بے انصافی ظلم اور جبر پر نعرۂ حق بلند کرتا ہے۔ ایک جینوئن شاعر اپنے عہد کی تاریخ بھی مرتب کر رہا ہوتا ہے کیونکہ وہ ہمیشہ سچ لکھتا ہے اسی طرح اعجاز رضوی بھی اپنے اردگرد کے ماحول اور معاشرے سے بخوبی آگاہ ہیں اور ان کی قوت مشاہدہ کمال کی ہے۔ یہ سیاسی اور سماجی حالات کو شعری قالب میں ڈھالتے نظر آتے ہیں کیونکہ معاشرے سے تعلق اور جڑت ان کی شاعری کو آفاقی اور لازوال بناتی ہے۔ اسی طرح کے جذبات اور کیفیات سے مزین یہ نظم دیکھیے:

میرے دفاع کے سب منصوبے سارے نقشے
اب میرے سردار کے قبضے میں ہیں
اور میری تلوار کا دستہ لوٹ گیا ہے
میرے ترکش میں جتنے بھی تیر رکھے ہیں ان پر میری ماں کی چادر جھول رہی ہے
میری کماں ہر اک تنکے کو تیر بنا کر
میرے قبیلے کے سب گھبرو چور سپاہی کھیل رہے ہیں
چند اک بچے اپنے باپو کے کہنے پر مجھکو پاگل پاگل
کہہ کر چھیڑ رہے ہیں
تم سے میری اک درخواست ہے اے سردار
اپنے باج گزاروں میں اب میرا نام بھی لکھ لو

.....

کتنی خوبصورتی اور فنی مہارت سے اعجاز رضوی نے موجودہ سسٹم کے کرداروں کو بے نقاب کیا ہے اور شاعری کے دبیز پردوں میں ہمارے معاشرے کی پوری کہانی قلمبند کر دی ہے اور زندہ معاشروں میں سچے فنکار کا یہی رول ہوتا ہے جو اعجاز رضوی بطریق احسن نبھا رہے ہیں۔

اعجاز رضوی لفظوں کو اُجالنے اور نکھارنے کے فن میں طاق ہیں یہی وجہ ہے کہ یہ ہمیشہ نئے راستے اور نئے نئے امکانات ڈھونڈتے نظر آتے ہیں یہ مسلسل ریاضت اور انتھک محنت و جدوجہد پر یقین رکھتے ہیں یہ اپنا کام پوری دیانتداری سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کام بھی زندہ اور نام بھی جگمگ رہا ہے۔ یہ آئندگان میں بھی اپنے فکر و فن کی بدولت زندہ و پائندہ رہیں گے۔ آخری میں ان کے کچھ اشعار دیکھیے:

خوابوں کے انبار اُٹھاتے پھرتا ہوں
کاندھوں پر گھر بار اُٹھاتے پھرتا ہوں
ایک پرندے کی خاطر میں صدیوں سے
شانوں پر اشجار اُٹھائے پھرتا ہوں
بچپن میں اک کاغذی کشتی کیا ڈوبی
میں اب تک پتوار اُٹھائے پھرتا ہوں

.....

گزر گاہوں پہ سناٹا ہوا ہے
کہ میرا دل ہی سُونا سا ہوا ہے
جو میری آنکھ سے ٹپکا نہ برسوں
وہ آنسو پھیل کر دریا ہوا ہے

.....

ضروری تو نہیں رسوائیاں ہوں
محبت آبرو بھی چاہتی ہے

.....

میرے سامنے آب و ہوا کا دریا ہے
اس پر کیسے پُل تعمیر کیا جائے

☆☆☆☆☆

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے نلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داستان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانحِ عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

قول حضرت علیؓ: حضرت علی علیہ السلام سے ایک قول منسوب ہے کہ جس پر احسان کرو اس کے شر سے بچو۔ چونکہ انتظامیہ میں رہتے ہوئے احسانات کرنے کے بہت مواقع ملتے ہیں اس لئے شر انگیزیاں بھی اسی حساب سے بھگتنی پڑتی ہیں۔ گو یہ فہرست خاصی طویل ہے لیکن اختصار کے پیشِ نظر چند واقعات پیش کیے جا رہے ہیں۔

پتہ نہیں انہوں نے کن لوگوں کا ذکر کیا تھا جن پر احسان کر کے ان کی ریشہ دوانیوں سے بچنا چاہئے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کا اشارہ رذیلوں کی طرف ہو یا ان کی طرف جو مخصوص ذہن رکھتے ہیں۔ وزارتیں تقسیم

ہوئیں تو پنج پیاروں کو بھی اس سے نوازا گیا۔ لالیکا کو غالباً زراعت ملی۔ قبلہ کانجو صاحب کے حصے میں وزارت خارجہ آئی۔ تھے تو منسٹر آف اسٹیٹ لیکن قرب سلطانی کی وجہ سے وزیر خارجہ بھی ان کے سامنے منقار زیر پر رہتا تھا۔ محترم جن مشکل حالات میں ممبر اسمبلی بنے تھے اس کا ان کو پورا ادراک تھا۔ ملتان میں یہ ایک طرح کا رواج تھا کہ جو وزیر بھی آتا وہ میرے ساتھ چائے ضرور پیتا یا گھر میں آ کر کھانا کھاتا۔ تسنیم نواز گردیزی، چوہدری غفور، احمد محمود، لالیکا وغیرہ۔ دو وزیر جنہوں نے کبھی آنے کی تکلیف نہ کی وہ صدیق خان کانجو اور شاہ محمود قریشی تھے۔ صدیق خان کانجو کئی ماہ اس انتظار میں رہے کہ میں ان کے در دولت پر جا کر حاضری دوں گا۔ جب ایسا نہ ہوا تو انہوں نے لالیکا صاحب کو ساتھ ملا کر میاں نواز شریف کے کان بھرنے شروع کر دیئے کہ D.C has got a soft corner for the Syeds of South- میاں صاحب جنوب کے سادات کو پسند نہیں کرتے تھے۔ سیاسی مصلحتوں کی بنا پر سب سے بگاڑ پیدا کرنا بھی ممکن نہ تھا اس لئے ایک ایسا تعلق قائم کر رکھا تھا جسے Love hate Relationship کہتے ہیں۔ جب میں رحیم یار خان میں تھا تو اس وقت بھی ان کا حکم تھا کہ اس شخص کو ضلع میں گھسنے نہیں دینا، ریسٹ ہاؤس کا کمرہ الاٹ نہیں کرنا وغیرہ۔ بااین ہمہ ہم نے کبھی بھی اس کو ناجائز تنگ نہ کیا بلکہ جب بھی ملنے آیا تو اس کو عزت دی۔ ایک دن میں گھر سے باہر نکلا تو دیکھا کہ گیٹ کے پاس یوسف رضا کھڑا ہے۔ میں نے گاڑی روک لی۔ بتانے لگا "میں آپ کو ملنے آیا تھا لیکن گارڈ نے کہا ہے کہ آپ کسی ضروری کام کے سلسلے میں جا رہے ہیں۔" میں واقعی جلدی میں تھا۔ میں نے گارڈ کو سرزنش کی۔ اسے اپنے گھر لے آیا، چائے پلائی اور جس کام کے لئے آیا تھا وہ کر دیا۔

ایک دن کانجو نے کسی شخص کی سفارش کرنی تھی۔ ان کا فون آیا کہنے لگے "او پیر جی! بڑا عرصہ ہوا ہے ملاقات نہیں ہوئی۔ کبھی ملیں تو سہی۔" میں نے کہا "کانجو صاحب! یہ بہت چھوٹی دنیا ہے جس میں ہم لوگ بستے ہیں۔ ان شاء اللہ کبھی نہ کبھی تو ملاقات ہو جائے گی۔"

شاہ محمود کا معاملہ مختلف تھا۔ الیکشن اس نے اپنی ہمت سے جیتا تھا۔ سیاست دانوں کے کام کاج تو انتظامیہ سے پڑتے ہی رہتے ہیں اور وہ روٹین میں ہو بھی جاتے ہیں۔ اس کی ناراضی کی دو وجوہ تھیں۔ ایک تو اسے میری حامد رضا سے دوستی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی دوسرا البتہ نفسیاتی مسئلہ تھا۔ بشیر حسین طاہر اسے غلط عادتیں ڈال گیا تھا۔ جب بھی وہ آتا تو طاہر صاحب اس کو ایئرپورٹ پر لینے جاتے۔ کبھی کبھی گاڑی کا دروازہ بھی کھول دیتے۔ یہ بات نہیں کہ وہ خوشامدی

تھا۔ وہ وقت کے لحاظ سے چلتا تھا۔ جس ہاتھ سے گاڑی کا دروازہ کھولتا وہ کبھی کبھی موصوف کے گالوں پر جڑ بھی دیتا تھا۔ وہ جب بھی کسی کی خوشامد کرتا تو اپنے تئیں سمجھتا کہ وہ ممدوح کو بے وقوف بنا رہا ہے۔

شاہ محمود مالی اعتبار سے تو ایماندار تھا، لائق بھی تھا اپنے کام کو خوب سمجھتا اور محنت بھی کرتا لیکن سیاسی مفاد کے لئے ہر کام کر گزرتا۔ اپنے ووٹروں کو خوش کرنا اس کی پالیسی تھی۔ اسے اس بات سے غرض نہ تھی کہ کام جائز ہے یا ناجائز۔ اس بات نے بتدریج ہمارے درمیان ایک خلیج پیدا کر دی اور عملاً ملاقاتیں بند ہو گئیں۔

کس قیامت کے یہ نامے میرے نام آتے ہیں:

ایک دن کمشنر نے مجھے فون کیا ''چیف سیکرٹری پرویز مسعود نے آج شام بلایا ہے تم فوراً لاہور پہنچو''۔ مجھے اس بات کا علم تو نہ تھا کہ اس نے کیوں بلایا ہے البتہ اتنا یقین تھا کہ کسی نہ کسی بہانے گوشمالی کرنا چاہتا ہے۔ میں شام کو اس کے گھر پہنچا تو وہ کیمپ آفس میں دوستوں کے ساتھ چائے پی رہا تھا۔ مجھے ویٹنگ روم میں کچھ دیر انتظار کرنا پڑا۔ جب اسے ملا تو بغیر کسی تمہید کے بولا ''شاہ محمود تم سے بڑا نالاں ہے۔ کہتا ہے کہ اس ڈی سی نے میرا ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ توہین اور تضحیک کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ جب میرا فیجر حلقے کے ووٹروں کے لائسنس بنوانے جاتا ہے تو یہ پلندہ اُس کے منہ پر دے مارتا ہے اور میرے دستخطوں پر Whitener پھیر دیتا ہے۔''

عرض کیا ''جہاں تک دستخطوں پر سفید لوشن پھیرنے کا تعلق ہے تو یہ بظاہر بڑی بچگانہ سی بات لگتی ہے اور مجھے کبھی اس کا خیال نہیں آیا البتہ دوسری بات درست ہے کہ میں اس کے کام نہیں کرتا۔''

''کیوں نہیں کرتے؟'' وہ غصے سے بولا۔

''کیوں کہ وہ ہمارے کام نہیں کرتا۔''

''تمہارا کیا کام ہوتا ہے۔'' اس کا غصہ دو چند ہو گیا۔ آنکھیں سرخ ہو گئیں اور مٹھیاں تقریباً بھنچ گئیں۔

''میرا ذاتی کام تو کوئی نہیں البتہ سپلیمنٹری گرانٹ کے لئے وہ چاہتا ہے کہ میں خود جا کر اس کے سامنے گڑگڑاؤں۔ Why should I go to him for this purpose'' میں اس سے بھی اُونچی آواز میں بولا۔ باہر بیٹھا ہوا عملہ سمجھا کہ مجذوب سے معتوب کا پیچا پڑ گیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ اُٹھ کر مجھ سے دست و گریباں ہو جائے گا یا کم از کم ایک پیپر ویٹ تو ضرور میری طرف پھینکے گا۔ جو شخص ممتاز جوہیے کو مارنے کے لئے ایک میل دوڑ سکتا ہے اس کے لئے ایک میز کو پھلانگنا کون سا مشکل کام تھا۔

میری توقعات کے برعکس حیرت انگیز طور پر اس کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ کہنے لگا ''بالکل ٹھیک کیا ہے۔ ہن لفنا نہ (اب لچک نہ دکھانا)''

چیف سیکرٹری صاحب سے مل کر میں

وزیراعلیٰ کو ملنے چلا گیا۔ کلب روڈ پہنچا تو وہ خبریں سن رہے تھے۔ میں سٹاف افسر کے پاس بیٹھ گیا۔ جب فارغ ہوئے تو اندر بلا لیا۔ میں کمرے میں داخل ہی ہوا تھا تو وائیں صاحب نرم لہجے میں بولے ''شاہ جی! شاہ محمود تم سے بڑا تنگ ہے۔ کیا بات ہے؟''

مجھے ساری بات سمجھ آ گئی۔ میں نے کہا ''سر! وہ آپ کا بہت مخالف ہے۔ بے سروپا اور بے تکی باتیں کرتا رہتا ہے۔ اسے اس بات کا قلق ہے کہ وہ وزیراعلیٰ کیوں نہیں بنا۔ کہتا پھرتا ہے نواز شریف نے ایک منشی کو وزیراعلیٰ بنا دیا ہے۔'' وائیں صاحب نے میری طرف غور سے دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہ بولے۔ میں سمجھ گیا کہ لوہا گرم ہے اس لئے آخری ہتھوڑا بھی چلا دیا ''جناب! یہ ہے تو مسلم لیگی لیکن پیپلز پارٹی سے پینگیں بڑھا رہا ہے۔ ہر ہفتے کی شام کو یوسف رضا گیلانی کے ساتھ اپنے بہنوئی محمد احمد کے گھر ملاقاتیں کرتا ہے۔ عنقریب ہی یہ شخص مسلم لیگ چھوڑ دے گا۔''

پوچھنے لگے ''تمہیں کیسے پتہ چلا ہے؟''

''اگر مجھے یہ پتہ نہ ہو کہ میرے حلقے میں کیا ہو رہا ہے تو پھر میری ڈپٹی کمشنری کس کام کی؟''

ہنس کر بولے ''کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ مجھے اس کا علم نہیں ہے۔ مجھے اس کی ہر حرکت اور چال کا پتہ ہے۔ میں اپنے وقت پر وار کرتا ہوں۔'' جی ایم سکندر کو بلا کر کہا ''شاہ صاحب جتنی گرانٹ مانگتے ہیں دے دی جائے۔''

شاہ محمود سے تعلقات بتدریج خراب ہوتے گئے۔ اس وقت یہ ڈارلنگ آف سول سروس مشہور تھا۔ بوجوہ فوجی جرنیلوں کے ساتھ بھی اس کے قریبی تعلقات تھے لیکن میرا کچھ بگاڑ نہ سکتا تھا۔

عیدین پر روایتاً ضلعی انتظامیہ سابق گورنر مخدوم سجاد حسین قریشی کو عید مبارک کہنے جاتی۔ میں نہ گیا تو مخدوم صاحب فوراً سمجھ گئے کہ ہمارے تعلقات کس نہج پر پہنچ گئے ہیں۔ ایک دن اچانک اپنی بڑی بیٹی زارا کے ساتھ تشریف لائے۔ میرے نوزائیدہ بیٹے محمد مرتضیٰ کو بلوایا، اس کے کان میں درود شریف پڑھ کر پھونکا اور ہزار روپے بھی دیئے۔ جب ہم چائے پی رہے تھے تو باتوں باتوں میں کہنے لگے ''سائیں ہم پرانے لوگ ہیں۔ پرانی قدروں کے علمبردار ہیں۔ ہمیں پتہ ہے کہ سرکاری نوکری کیا چیز ہوتی ہے، سرکاری افسروں کا کیا مرتبہ ہے۔ ان وزیروں کا کیا ہے آج ہیں، کل نہیں ہیں۔ نوجوان ہمیشہ ناتجربہ کار ہوتا ہے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے مجھے خاصا شرمندہ کیا اور متاثر بھی کیا۔ نہایت زیرک انسان تھے، بات کرنے کے فن میں یکتا تھے۔ چہرے کے تاثرات دیکھ کر بھانپ لیتے تھے کہ دوسرے کے دل میں کیا ہے۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ گورنری ویسے ہی چاندی کی طشتری میں پڑی ہوئی نہیں مل جاتی۔ اس

کے لئے فہم وادراک کے علاوہ تجربے کی بھی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔

کمشنر طارق فاروق: بدقسمتی سے طارقین کے متعلق میرا تجربہ کچھ اتنا اچھا نہیں رہا۔ سروس میں تین طارقوں سے واسطہ پڑا، ایک سے بڑھ کر ایک نکلا۔ طارق فاروق کے علاوہ ایک طارق محمود تھے جو گورنر پنجاب کے پرسنل سیکرٹری تھے۔ تیسرے طارق جنجوعہ جو فیڈرل گورنمنٹ میں سیکرٹری کلچر تھے۔ ان دونوں کا قصہ تو آگے چل کر آئے گا۔ فی الحال تو ذکر طارق فاروق کمشنر ملتان کا ہو رہا ہے جن کا ان سے تقابلی جائزہ لیا جائے تو بہر طور غنیمت تھے۔ دیکھنے میں خوش شکل، باتیں سراپا عقل، طبیعت میں ٹھہراؤ، طور اطوار میں رکھ رکھاؤ لیکن مزاج میں شک اور وہم بھی کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو اُن کی تربیت تھی۔ ان کے والد نے دو شادیاں کر رکھی تھیں۔ پہلی بیوی کا تعلق صوبہ سرحد کی پٹھان فیملی سے تھا اور دوسری طارق کی والدہ تھیں جو کسی سکول میں ٹیچر تھیں۔ جائیداد میں بٹوارے کے ڈر سے ان کے سوتیلے بھائی خوش نہ تھے۔ وہ عمر میں ان سے کافی بڑے تھے۔ ان کی والدہ کو ہمیشہ ڈر رہا کہ وہ طارق کو گزند پہنچائیں گے چنانچہ اس نے اسے چھپا چھپا کر خوف اور ڈر کی فضا میں اس طرح پالا پوسا جس طرح ایک مرغی چوزے کی حفاظت کرتی ہے۔ بنیادی طور پر ذہین طالب علم تھے پھر والدہ کا سارا وقت انہیں پڑھانے اور تعلیم و تربیت میں گزرتا۔ سول سروس کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کر لیا۔ بھلے وقت تھے، تعیناتیاں بھی اپنی مرضی سے کرائیں۔ جب اسلم اولیں صاحب سینئر ممبر بورڈ آف ریونیو کے داماد بنے تو سونے پر سہاگا ہو گیا۔ فیصل آباد میں ڈپٹی کمشنر رہے اور پھر ملتان کی کمشنری بغیر کسی تگ و دو کے مل گئی۔

ان کے محتاط ہونے کا اندازہ تو صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بشیر حسین طاہر کے تبادلے پر رسماً بھی چند لفظ نہ کہے بلکہ ایک پرانی رسم کو توڑا۔ انہیں بخوبی علم تھا کہ افسر اچھا ہو یا برا اُس کی رخصتی پر جو الوداعی تقریب ہوتی ہے اس میں صرف کلمات خیر کہے جاتے ہیں۔ وہ چند بول بولنے سے گریزاں تھے۔ انہیں اس بات کا بھی پتہ تھا کہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس کی سالانہ خفیہ رپورٹ خراب نہ کر سکتے تھے کیونکہ اس کا مخالفانہ پراپیگنڈہ پہاڑ پر بھی گرتا تو اس میں دراڑیں پڑ جاتیں۔

میری ان سے پہلے کوئی خاص واقفیت نہ تھی۔ ہم نے کہیں اکٹھے کام بھی نہ کیا تھا۔ بشیر حسین طاہر نے جہاں مولویوں کو بدظن کیا تھا ہو سکتا ہے کچھ باتیں ان کے کان میں بھی پھونک گیا ہو۔ وزیر اعلیٰ سے میری ملاقاتیں اُنہیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں لیکن کچھ کر نہ سکتے تھے۔ یہ بھی کوئی خاص قابل اعتراض بات نہ تھی۔ ایسا ہوتا رہتا ہے۔ سینئر افسر کبھی

بھی نہیں چاہے گا کہ اس کا ماتحت وزیر اعلیٰ سے یوں گھل مل جائے لیکن اس کے باوجود بظاہر ہمارے تعلقات ٹھیک رہے اور ان میں کسی قسم کا رخنہ نہ پڑا۔ میں نے انھیں ہمیشہ درست مشورہ دیا اور کبھی ایک لمحے کے لئے بھی نہ سوچا کہ کمشنر کی ٹانگ کھینچی جائے یا اس کو حکومت کے سامنے شرمندہ یا شرمسار کیا جائے۔ سازش کرنا میرے خمیر میں نہیں ہے۔ ایک مرتبہ وہ فیملیز کے لئے رقص و سرود کی محفل منعقد کروانا چاہتے تھے۔ میں نے مشورہ دیا کہ ایسا نہ کریں اس سے انتظامیہ کے لئے مسائل کھڑے ہو سکتے ہیں۔ طبعاً لبرل انسان تھے، کچھ بیگمات کا پریشر تھا۔ کہنے لگے ''مجھے ان لوگوں کی پروا نہیں۔ میں یہ پروگرام ضرور کراؤں گا۔''

اچھا پروگرام تھا۔ لاہور سے رقاصائیں اور گلوکار آئے تھے۔ ظاہر ہے اس قسم کی محفلوں میں کچھ مست ملنگ بھی ہوتے ہیں۔ جب دخترِ رز مناسب مقدار میں حلق سے نیچے اتر جائے تو پھر شغل میلہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔

اگلے دن دوپہر کو ان کا فون آ گیا۔ کہنے لگے ''کچھ سنا ہے؟ بڑی تشویش ناک خبر ہے۔ کسی مقامی صحافی نے غلط سلط رپورٹ بھیجی ہے اس کو رکوائیں۔'' میں نے مجسٹریٹ بھیج کر خبر رکوا دی اور رپورٹ کی کاپی منگوا لی۔ رات کو تو غالباً کچھ نہ ہوا تھا لیکن رپورٹ واقعی ہلا دینے والی تھی۔ ایسے پتہ چلتا تھا کہ رپورٹر وہی وہانوی کی تصنیفات اور تعلیمات سے فیض یاب ہوا تھا۔ رپورٹ میں صرف پورنوگرافی نہیں کی گئی تھی، اس کی ''گرافک ڈیٹیل'' بھی تھی۔ فکشن کی جزئیات کو جنس کے شیرے میں بھگو بھگو کر لکھا گیا تھا۔ جب میں نے انھیں کوٹھی پر جا کر رپورٹ دکھائی تو ان کو پسینہ آ گیا۔ بولے ''آپ نے درست ہی کہا تھا۔ یہ علاقہ کلچرل پروگراموں کا متحمل نہیں ہو سکتا خاص طور پر جب انتظامیہ کرائے اور اس میں شریک ہو۔''

ایک دن مجھے دفتر میں بلایا کہنے لگے ''ضروری بات کرنی تھی، سوچا فون پر مناسب نہیں ہوگا۔'' میں نے سوچا شاید لا اینڈ آرڈر کے حوالے سے کچھ کہنا چاہتے ہیں یا مالیہ کی وصولی کے متعلق چند ہدایات دینا چاہتے ہیں۔ میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ کچھ دیر کے لئے خاموشی رہی۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن کہہ نہیں پا رہے۔ جب میں نے ان کی طرف استفسارانہ نظروں سے دیکھا تو بولے ''آپ کو تو علم ہی ہے کہ کمشنر ڈویژن میں سب سے اہم شخص ہوتا ہے اور اس کی بیگم بھی اوّلیت کی ایکسٹینشن ہوتی ہے اسی لئے اسے خاتونِ اوّل صرف کہا نہیں بلکہ مانا بھی جاتا ہے۔ لیڈیز کلب اور خواتین کی دیگر بھی محفلوں میں آپ کی بیگم اور ایس ایس پی کی بیوی اُسے اہمیت نہیں دیتیں بلکہ بسا اوقات تو مذاق اڑاتی ہیں۔''

مجھے یہ سن کر بڑا تعجب ہوا اور ساتھ افسوس بھی کہ اس قسم کی صورتِ حال کیوں پیدا ہو گئی ہے۔ کمشنر کا احترام جس طرح ہم پر لازم ہے اسی طرح کم و بیش اس کی بیگم کی بھی توقیر ہونی چاہیے۔

عرض کیا "مجھے یہ سن کر افسوس ہوا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے کبھی بھی سروس کے مسائل گھر میں ڈسکس نہیں کیے۔ دفتر کی بات میں دفتر میں ہی چھوڑ آتا ہوں لیکن اب جبکہ آپ نے اس واقعہ کی نشاندہی کر ہی ڈالی ہے تو میں ان سے جواب طلبی کروں گا۔ ایس ایس پی کی بیوی اور میری بیگم بڑی گہری سہیلیاں تھیں اور مرزا صاحب کو بھی میں اپنے چھوٹے بھائیوں کی طرح سمجھتا تھا۔ میں نے دونوں کو بلا کر ناراضی کا اظہار کیا۔ انہوں نے واقعے کی صحت سے انکار تو کیا لیکن مجھے محسوس ہوا کہ بات میں کچھ نہ کچھ وزن ضرور ہے۔ چند دن بعد میں نے کمشنر اور اُس کی بیگم کا کھانا کیا اور اس طرح صلح صفائی کی صورت نکلی۔

طارق فاروق صاحب کی ایک کمزوری یہ بھی تھی کہ افسروں کی اے سی آر لکھنے میں بہت تاخیر کر دیتے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ان کی عادت ہو لیکن اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ افسر قابو میں رہتا ہے۔ میری پروموشن کا بورڈ بیٹھنے والا تھا، میں نے انہیں فارم دیئے اور درخواست کی کہ میری اے سی آر لکھ دیں۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ پہلی فرصت میں لکھ دیں گے۔ مہینہ گزر گیا لیکن رپورٹ نہ لکھی گئی۔ میں نے ایک دفعہ پھر یاد دہانی کرائی اور جو بات انہوں نے کہنی تھی وہ بھی میں نے ہی کہہ ڈالی۔ مصروفیت کی وجہ سے رپورٹ نہ لکھی گئی۔ دو تین دفعہ ایسا ہوا۔ آخر میں ان کے اے سی جی نے مجھے پیغام دیا کہ ان کے پاس وقت نہیں ہے اس لئے رپورٹ نہیں لکھی جا سکتی۔ رولز کے تحت رپورٹنگ افسر کے لئے لازم ہے کہ وہ پیریڈ ختم ہونے کے ایک ماہ کے اندر رپورٹ لکھے۔ مجھے ان سے اس قسم کے برتاؤ کی توقع نہ تھی۔ ایک فنکشن پر سرکٹ ہاؤس میں ملے تو میں نے ان سے ہاتھ ملانے سے انکار کر دیا۔ سارا ماتحت عملہ دیکھ رہا تھا۔ رات کو ان کا فون آیا کہ مجھے فوراً ملو۔ میں ان کے گھر گیا تو کہنے لگے "کیا بات ہے۔ آپ کچھ اُکھڑے اُکھڑے لگ رہے تھے، رُخصت ہوتے وقت دعا سلام بھی نہیں کی۔"

میں نے کہا "جب آپ کا رویہ معاندانہ ہوگا تو مجھ سے کیا توقع رکھتے ہیں۔ میں نے آپ کو صرف اپنی اے سی آر لکھنے کا کہا ہے جو میرا حق ہے، یہ تو نہیں کہا کہ کیا لکھیں!" بولے "آپ جیسے شخص کی اے سی آر لکھنا کچھ آسان کام نہیں ہے، بہت کچھ سوچنا پڑتا ہے۔"

خیر دوسرے دن انہوں نے اے سی آر لکھ دی جس میں میری تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے تھے۔

غلام حیدر وائیں کو نہ جانے کیا سوجھی اس نے

ایک حکم نامہ جاری کیا جس کی رو سے ہر افسر کو اپنے الاٹ شدہ پلاٹوں کی فہرست حکومت کو مہیا کرنا تھی۔ اس نے سیکرٹری سروسز کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ مکمل فہرست اس کو ایک ماہ میں پیش کرے۔ سینئر افسروں میں کھلبلی مچ گئی۔ ایک شام اچانک میرے گھر طارق فاروق اور میجر مشتاق ڈی آئی جی آئے اور کہنے لگے "تمہارے غلام حیدر وائیں سے گہرے مراسم ہیں۔ فہرست شائع ہونے سے شریف آدمیوں کی قلعی کھل جائے گی۔ ان پلاٹوں کی وجہ سے ہی تو ہماری سفید پوشی کا بھرم قائم ہے نہیں تو اس تنخواہ میں تو کسی سکول کے مدرس کا بھی گزارا نہیں ہو سکتا۔ آپ وائیں صاحب کو سمجھائیں۔"

میں انہیں کیا جواب دیتا۔ میرے وائیں سے کوئی خصوصی مراسم نہیں تھے۔ درحقیقت ملتان آنے سے پہلے میں انہیں جانتا تک نہ تھا۔ ادبی اور انتظامی حوالوں سے وہ میرا احترام کرتے تھے لیکن تھا تخت گیر اور اپنی دھن کا پکا۔ ایک ماتحت کی بات کہاں سنتا۔ میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ میں Wyne Watcher ضرور ہوں، اس کا لنگوٹیا نہیں لیکن وہ کوئی بات سننے یا ماننے کے لئے تیار ہی نہ تھے۔ بس ایک بات ہی دہراتے کہ وہ تمہارا دوست ہے، ہماری بے عزتی ہو جائے گی۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق میں نے حامی بھر لی۔ میں نے ازخود تو وائیں سے بات نہ کی حامد رضا گیلانی کے ذریعے کہلوایا کہ آپ سایوں کا تعاقب کر رہے ہیں۔ یہ اتنی طاقتور سروس ہے کہ آپ اجتماعی طور پر ان کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔ کسی فرد واحد کو بدل دینا اور بات ہے اور کلاس پر ہاتھ ڈالنا کار دارد۔ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالیں گے تو چھتے کو نقصان ہو یا نہ ہو، ہاتھ کی خیر نہیں۔

وائیں مخدوم صاحب کو کہنے لگا "مجھے اس امر کا بخوبی احساس ہے۔ میں تو صرف یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ کون کتنے پانی میں ہے۔ یہ جو مسٹر کلین اور پھنے خان بنے پھرتے ہیں، ان کا بھرم تو کھلے گا۔ پھنے خانوں کا بھرم پھر بھی نہ کھل سکا۔ سعید مہدی نے جو ان دنوں وزیر اعظم کا سیکرٹری تھا، حکم دیا کہ وزیر اعلیٰ کو فہرست مہیا نہ کی جائے۔ کہتا ہے تو کہتا رہے اس کو اپنی حد میں رہنا چاہئے۔ منشی کہیں کا......!

طارق فاروق کا تبادلہ بطور کمشنر لاہور ہو گیا۔ ہم نے ان کے اعزاز میں گرینڈ الوداعی ڈنر دیا۔ ملتان کے سب معززین اور سرکاری محکموں کے سربراہوں کو مدعو کیا۔ میں نے اپنی تقریر میں ان کی خدمات کو سراہا۔ انہوں نے بھی میرے متعلق نیک خیالات اور خواہشات کا اظہار کیا۔

اب اسے اتفاق کہیے کہ ان کے لاہور پہنچتے ہی میری دوسری اے سی آر due ہو گئی۔ اب کے مجھے نہ تو منت سماجت کرنا پڑی اور نہ کسی قسم کی ناراضی کی نوبت آئی۔ انہوں نے ازخود بکمال شفقت اے سی آر لکھ ڈالی۔

مختلف کالموں میں تو وہ ہیرا پھیری نہ کر سکے البتہ Pen picture میں من کی بات صفحہ قرطاس پر لے آئے۔ غالباً ملتان والا واقعہ وہ بھول نہیں پائے تھے یا کمزور حافظے کی وجہ سے ہماری سب خدمات اور 'کارنامے' بھلا بیٹھے تھے۔انہوں نے اپنے دست مبارک سے کچھ اس قسم کے موتی پروئے۔

Ashrewed tactition who is very deft in handling politicians. He has a great knack for organising public extravaganzas especially when an element of self projection is involved.

انہوں نے بزعم خود کمال چالاکی، ہوشیاری اور دانائی سے میرے سروس کیریئر پر مہر لگا دی تھی۔جب وہ کاؤنٹر سگنیچر کے لئے بورڈ آف ریونیو گئی تو سینئر ممبر ڈاکٹر امتیاز نے لکھا:

The officer has been rightly praised by the reporting officer. These are the qualities so essential for a successful field officer.

("کمشنر نے ڈی سی کی صحیح تعریف کی ہے۔ آفیسر کی جن خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے اُن کے بغیر ایک فیلڈ افسر کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔")

ڈاکٹر امتیاز سے میری کوئی واقفیت نہ تھی لیکن انہوں نے میرے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا۔وہ ان معدودے چند سینئر سول سرونٹس میں سے تھے جو کبھی بھی پندار مناصب میں گرفتار نہ ہوئے اور نہ ہی اپنی حیثیت پر تفاخر کیا۔ حکومت کے کسی وزیر یا ممبران اسمبلی کو جرأت ہی نہ ہوتی تھی کہ انہیں کوئی ناجائز کام کہیں۔ اسد علی شاہ صاحب کو زمین اور پلاٹوں کی ہوس تھی اس مردود رویش نے کبھی منفعت کا سوچا تک نہ تھا۔

سروس میں اے سی آر کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔اگر ایک بھی خراب ہو جائے تو افسر کے بڑھتے ہوئے قدم رُک جاتے ہیں۔ یہ ساری عمر میزائل کی طرح اس کا پیچھا کرتی ہے۔جب سینئر افسر کوئی ریمارکس دے دے تو رپورٹنگ افسر کا لکھا ہوا از خود ختم ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کمال ہشیاری سے طارق فاروق سے اختلاف نہ کیا تھا، صرف ان الفاظ کے معانی اور مفاہیم بدل دیئے تھے۔ یہ غالباً سول سروس کی تاریخ میں پہلی بار ہوا تھا۔ بالفرض وہ نہ بھی لکھتے تو بھی یہ لوگ میرا کچھ نہ بگاڑ سکتے تھے۔ جب آپ ایک دفعہ لکھ دیتے ہیں کہ افسر ایماندار ہے محنتی ہے، ذی فہم اور ذی شعور ہے تو پھر Pen picture ان خصوصیات کی عکاس ہونی چاہئے۔ اگر نہیں ہے تو پھر وہ خبث باطنہ کے زمرے میں آتی ہے جس کا عدالتیں سنجیدگی سے نوٹس لیتی ہیں۔

[جاری ہے۔]

میں اپنے آپ میں خالی کہاں کہاں سے ہوا

شاعرِ امروز

عزیر یوسف

شاہد ماکلی

عزیر یوسف کی مثال صحرائی مسافر کی سی ہے جو امید وبیم کا زادِ راہ لیے ایک لامتناہ دشتِ امکان کے سفر پر نکلا ہوا ہے۔ تشنہ لبی، آبلہ پائی، واماندگی، شوریدہ سری، جھلسا دینے والی تپش اور ہر قدم دوری منزل کے جاں سوز احساس کو ہنس کر جھیلتا ہے اور نخلستان کی تلاش جاری رکھتا ہے۔ بے پناہ تخلیقی اضطراب اور ناآسودگی کو عزیر یوسف کی اساسِ شعری قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ رنج سے راحت، نہاں سے عیاں، بست سے کشاد، غبار سے روشنی، رکاوٹ سے روانی، خالی پن سے معموریت اور نہ ہونے سے ہونا کشید کرتا ہے؛ اپنی تگ وتاز کو اظہاریے میں لاتا ہے۔ مختلف حالتوں اور حیرتوں سے خود بھی دوچار ہوتا ہے اپنے ملال ومسرت میں اپنے قاری کو بھی شریک کرتا ہے۔ ان کی فنی پختگی اور معنیاتی نیرنگی لائقِ تحسین ہے۔ معاصر شعریات کے گہرے مطالعات اور داخلی خارجی مشاہدات نے ان کی غزل کو تابندگی، تاثیر، توانائی اور گہرائی سے ہم کنار کر دیا ہے۔

عزیز یوسف 9 جون 1989 کو شیخوپورہ میں پیدا ہوئے۔ 2022 سے شعر گوئی کا آغاز کیا۔ جی سی یونیورسٹی فیصل آباد سے زوالوجی میں بی ایس آنرز کی۔ 3 فروری 2022 سے اب تک وارث شاہ ڈگری کالج جنڈیالہ شیر خان (شیخوپورہ) میں لیکچرر کے طور پر فرائضِ تدریسی سرانجام دے رہے ہیں۔ ذیل میں ان کے کچھ منتخب اشعار:

تو جو نکلا تو دوسروں کے لئے
مجھ میں آنے کا راستہ نکلا

.....

کھا گئی حسن مرے گاؤں کا دھیرے دھیرے
شہر سے گاؤں کی جانب جو سڑک آئی ہے

.....

آنکھ کھلتی ہے کسی اور جہاں میں میری
بند آنکھوں میں کوئی اور جہاں رکھا ہے

.....

بتا رہا ہوں مرے گرد روشنی کم ہے
بتا رہا ہوں مرے گرد چھا رہا ہے غبار

.....

سوچ سکتا ہوں تجھے دیکھ نہیں سکتا میں
کیا بتاؤں کہ تجھے میں نے کہاں رکھا ہے

.....

جھکنا پڑتا ہے مجھے زخم کھجانے کے لئے
اتنی زنجیر کہاں پاؤں اٹھانے کے لئے

گھوم پھر کر وہی دیوار مرے آگے تھی
بند رستے کو بہت دیر گھمایا میں نے

لوگ سمجھے ہیں، محبت کو لئے بیٹھا ہوں
حادثے اور بھی ہوتے ہیں سنانے کے لئے

ایک دو اشکوں سے گریہ نہیں پورا ہوتا
اپنی آنکھوں میں جگہ اور بنا پانی کی

سانحے کی اور کیسی شکل ہوتی ہے عزیر
اُس نے دل پر ہاتھ رکھا اور دل دھڑکا نہیں

اندر بھی تھا خلا سو خلا دیکھتا رہا
میں آسماں کی سمت کھڑا دیکھتا رہا

میری نشست اُس سے ذرا دور تھی مگر
میں اُس کے ساتھ خالی جگہ دیکھتا رہا

کچھ اور دیکھنے کو نہیں تھا کہ دیکھتا
سو وقت کو گزرتا ہُوا دیکھتا رہا

میں نے مانگا ہی نہیں اُس کو پشیمانی میں
بے کسی داغ گدائی سے کہیں آگے ہے

بتا رہا تھا مجھے کوئی میرے بارے میں
سنا رہا تھا کہانی سنی سنائی ہوئی

اس قدر خالی پڑا ہوں اپنی وسعت میں عزیر
اپنے حصے کے خلا میں ٹانکتا ہوں کائنات

اپنے ہونے پہ نہ ہونے کا نشاں رکھا ہے
صاف ظاہر ہوں مگر خود کو نہاں رکھا ہے

اُس نے رکھا ہے مجھے ساتھ تو اپنے لیکن
دل ہی رکھا ہے مرا، دل میں کہاں رکھا ہے

اُکھڑ رہا ہے مرا جسم کتنے حصوں سے
کہ نقش گر سے مرے نقش جاوداں نہ بنے

یہاں وہاں کی اذیت میں یہ بھی دھیان رہے
جہان دو ہی رہیں، تیسرا جہاں نہ بنے

کبھی خدا سے تعلق بنا کے دیکھوں گا
ازل ابد سے یہ پردے اٹھا کے دیکھوں گا

کہیں یہ خواب مری راہ میں نہ پڑتا ہو
میں اپنے خواب سے آگے بھی جا کے دیکھوں گا

نکل چکا ہوں زمیں سے میں واپسی کے لیے
جو رہ گیا ہے تماشا وہ آ کے دیکھوں گا

ذرا سا وقت سے آگے چلا رہا ہے مجھے
اسی لیے تو یہ رستہ ڈرا رہا ہے مجھے

میں اِس طرف سے نہ بڑھتا تو ختم ہو جاتا
وہ اُس طرف سے برابر گھٹا رہا ہے مجھے

رکا ہوا بھی مسلسل سفر میں رہتا ہوں
زمیں کے ساتھ یہ سورج گھما رہا ہے مجھے

یوں نہ دب جائیں اکیلے میں صدائیں اپنی
مری آواز سے آواز ملا ، شور مچا

کہیں کے ہوتے ہوئے رابطہ مکاں سے ہوا
مکالمہ جو ہوا بھی، تو بے زباں سے ہوا

میں اُس کی سمت جو نکلا تو کچھ نہیں تھا وہاں
وہیں کھڑا تھا، اشارہ مجھے جہاں سے ہوا

تمھارے بعد بدن میں تلاش کرتا ہوں
میں اپنے آپ میں خالی کہاں کہاں سے ہوا

☆☆☆☆☆

غزل

آواز کا جادو بھی جگانے نہیں دیتے
چڑیوں کو وہ اب شور مچانے نہیں دیتے

ہرنوں پہ اسیری کی وہ تہمت نہیں دھرتے
گھر تک اگر آ جائیں تو جانے نہیں دیتے

پلکوں کو جھپکنے کی اجازت نہیں ملتی
محفل کو بھی وہ رنگ پہ آنے نہیں دیتے

کیا سچ ہے کہ اک جھوٹ دکھائی نہیں پڑتا
وہ بات کی تفصیل میں جانے نہیں دیتے

کس اَوج پہ تکریم ہے معزول سروں کی
وہ بارِ نزول بھی اُٹھانے نہیں دیتے

وہ دادِ شجاعت بھی تو دیتے نہیں خالد
یہ چاک وہ سینے پہ سجانے نہیں دیتے

خالد احمد

غزل

یہ پیار پر بھی تجھے پیار کیوں نہیں آتا
اِس اپنی خُو کو کہیں مار کیوں نہیں آتا

جو عکس و رنگِ جمال و ملال ہے دل میں
کسی طرح سرِ اظہار کیوں نہیں آتا

کھلا یہ راز کہ بدنیتی کے پیڑوں پر
جو بُور آئے بھی تو بار کیوں نہیں آتا

جو اُس کی حلقہ بگوشی پہ کوستے تھے مجھے
نظر انہیں مرا انکار کیوں نہیں آتا

خبر ہو کیا تجھے، دنیا ہے دسترس میں مگر
اِدھر ہمارا دلِ زار کیوں نہیں آتا

جو دِکھ رہا ہے اِدھر وہ بھی دیکھتے نہیں ہم
تو کیا کہیں نظر اس پار کیوں نہیں آتا

جنوں کی دھج کے زمانے کدھر گئے عالی
کوئی خوشی سے سرِ دار کیوں نہیں آتا

جلیل عالی

غزل

غفلت شعار دیکھ کوئی دیکھتا بھی ہے
جب سر پہ آپڑے گی، وہی آسرا بھی ہے

پائے ثبات، تیر نظر، عزم بے پناہ
سد سکندری ہے مگر راستہ بھی ہے

گم کردہ آشیاں سہی، بے کارواں سہی
اندر کی روشنی مجھے قبلہ نما بھی ہے

چاروں طرف ہے دھند مگر دل کے نور سے
آنکھوں میں روشنی کا کوئی سلسلہ بھی ہے

حیرانیوں کو اور بھی حیرانیاں ہوئیں
ان مول موتیوں کو کوئی تولتا بھی ہے

سب کے نصیب میں کہاں رفعت شناسیاں
آخر دہان غار کوئی کھولتا بھی ہے

اس پر فصاحتوں کے کھلیں گے ہزار در
جو بولنے سے پہلے اسے تولتا بھی ہے

وا ہے دل و نگاہ پہ نظارہ جمال
یہ رات ہے تو آخرِ شب رتجگا بھی ہے

بے ساختہ حروف و معانی سے بے نیاز
شفاف آنسوؤں میں کوئی بولتا بھی ہے

وہ جو متاع فکر کبھی آرزو رہی
اس کو ہنر ریاض کا اب ڈھونڈتا بھی ہے

سید ریاض حسین زیدی

غزل

اکثر دل کی بات ادھوری رہ جاتی ہے
طوطے اُڑ جاتے ہیں چُوری رہ جاتی ہے

کیسے کیسے رنگ بدلتی ہے یہ مٹی
پاؤں تلے کی خاک ہی بھوری رہ جاتی ہے

بات نبھانی پڑتی ہے ، گو آخر آخر
عشق نہیں رہتا مزدوری رہ جاتی ہے

دل بے قابو ہو جاتا ہے اُس سے مِل کر
دھری دھرائی رسمِ حضوری رہ جاتی ہے

کسی پہ کب افشا ہوتی ہے اُس کی خوشبو
بندھی بندھائی جو کستوری رہ جاتی ہے

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

نسبتِ قیس بنی آخری تنکا خالد
بارِ محمل نہ اُٹھا ناقۂ دانائی سے

غزل

کتنا اس دل نے کر دیا پاگل!
اُس کے اِک تِل نے کر دیا پاگل

آئنے میں جو میرے سامنے تھا
اُس مقابل نے کر دیا پاگل

اِک نظر اُس کی میری سمت اُٹھی
چشمِ قاتل نے کر دیا پاگل

راستے اُس کے نوحے لکھتے ہیں
جس کو منزل نے کر دیا پاگل

اُس کی باتیں عجیب باتیں تھیں
مردِ کامل نے کر دیا پاگل

کتنی مشکل میں تھی وہ ناؤ نسیمؔ!
جسے ساحل نے کر دیا پاگل

میری تنہائی ہو گئی غارت
رنگِ محفل نے کر دیا پاگل

ایک گوٹا لگا دوپٹہ تھا
جس کی جھلمل نے کر دیا پاگل

دیر تک کیسے اُس کو دیکھیں ہم
اِسی مشکل نے کر دیا پاگل

حالِ دل اُس سے کہہ نہ پایا مَیں
دلِ بُزدِل نے کر دیا پاگل

نسیمِ سحر

غزل

خود یہ کتے بھی سوچنے لگے ہیں
بھونکنے والے کاٹنے لگے ہیں

تجھ کو دیکھا ہے جب سے دنیا کو
تیری آنکھوں سے دیکھنے لگے ہیں

سامنے قاضیوں کے لوٹ کا مال
چور آپس میں بانٹنے لگے ہیں

اتنی مہنگائی ہو گئی ہے کہ دوست
اجرتِ وقت مانگنے لگے ہیں

خاکِ تنہائی دیدہ کو میری
در و دیوار چاٹنے لگے ہیں

چشمِ قاتل پہ بھی لگا لیں نیام
وہ جو چہرے کو ڈھانپنے لگے ہیں

پہلے اوجھل تھے اب تو روگ مرے
صاف چہرے سے جھانکنے لگے ہیں

مخبری پر تھا جن کا کل راحت
اب تو اخبار چھاپنے لگے ہیں

راحت سرحدی

غزل

چاہو تو بیتے لمحات پلٹ بھی سکتے ہیں
چاہو تو، ماضی کی دُھول میں اَٹ بھی سکتے ہیں

گج فہمی کا ایک ہی وار اگر کاری نکلا
پیار بھرے دل اک دُوجے سے کٹ بھی سکتے ہیں

بچھڑے، تو ممکن ہے ساری عُمر نہ مل پائیں
کالے بادل تھوڑی دیر میں چھَٹ بھی سکتے ہیں

ہر ناممکن ، ممکن ، ممکن ، ناممکن ہو جائے
پھیلتے پھیلتے یہ حالات ، سمٹ بھی سکتے ہیں

کسی بھی لمحہ کُھل سکتا ہے قُفل زباں بندی
یہ سب اندھے، گونگے، بہرے ڈٹ بھی سکتے ہیں

پاؤں ہیں، تو وقفِ سلاسل بھی ہو سکتے ہیں
ہاتھ ہیں، تو سچ لکھتے لکھتے کٹ بھی سکتے ہیں

'اِن' بھی رہ سکتے ہی ہم، منظر میں جانِ انیس!
اور کبھی منظرنامے سے ہٹ بھی سکتے ہیں

محمد انیس انصاری

غزلیں

تُو نے کیا صورتِ حالات بنائی ہوئی ہے
کچھ بنے یا نہ بنے بات بنائی ہوئی ہے

حسن پر ناز تری ذات کا اعزاز سہی
ہم نے بھی عشق سے اوقات بنائی ہوئی ہے

چند آنسو تری پلکوں پہ کبھی دیکھے تھے
دکھ نے ہر فصل ہی برسات بنائی ہوئی ہے

ذکر ترا کسی محفل میں کا تھا ہم نے
خیر خواہوں نے ملاقات بنائی ہوئی ہے

اُس کی مرضی ہے کہ تو دیپ جلانا سیکھے
جس نے دھرتی کے لیے رات بنائی ہوئی ہے

سنگ باری ہے ثمر دار درختوں کا نصیب
جانے کس نے یہ مکافات بنائی ہوئی ہے

شام دلہن کے لیے چاند ہے دولہا اس کا
مل کے تاروں نے جو بارات بنائی ہوئی ہے

اس قدر بھی نہیں گلزار خوشی اچھی
خلق نے فتح تری مات بنائی ہوئی ہے

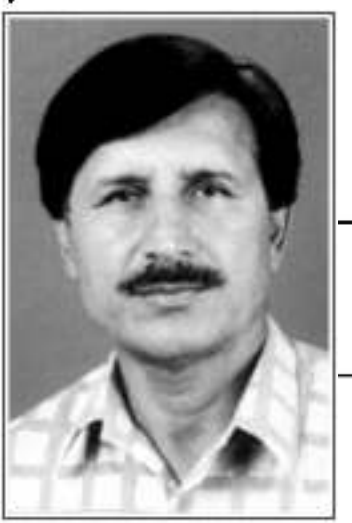

گلزار بخاری

اسی لیے ہمیں بھایا بہار کا موسم
یہیں ملا ترے قرب و جوار کا موسم

خدا کرے کہ یقیں ایک دوسرے پہ رہے
گماں کی نذر نہ ہو اعتبار کا موسم

کبھی کبھی ترے قائل بھی سوچ سکتے ہیں
کہاں گیا ترے قول و قرار کا موسم

تمام عمر ترے خواب دیکھتے گزرے
طویل یوں ہی نہ ہو انتظار کا موسم

ہم اہلِ درد کا چلتا نہیں ہے بس ورنہ
کبھی نہ ختم ہو الفت کا پیار کا موسم

متاعِ خاص ہے اقبال و فیض کی خوشبو
مہک رہا ہے اسی سے وقار کا موسم

کسی کو فصلِ نمو سے نہ ہو گِلہ گلزار
اگر ہو سب کے لیے برگ و بار کا موسم

غزلیں

گفتگو: میرے باب میں کیا ہے
مجھ سوا ، مجھ خراب میں ، کیا ہے

جتنا ہونا تھا ، ہو چکا میں خراب
حکمت اب سدِّ باب میں، کیا ہے

لوٹ کر پھر نہ آئے اپنی طرف
پاؤں رکھا ، رکاب میں کیا ہے

جانتا ہوں ، بتا نہیں سکتا
وہ جو دِکھتا ہے، خواب میں، کیا ہے

دیکھنا ہے ، نہ دیکھنے کے لیے
اُف: یہ منظر، عذاب میں کیا ہے

جو بھی ہوتا ہے، کر دِکھایا ہے
عشق مضموں، کتاب میں کیا ہے!

ہاتھ سے جب، نکل گیا ہے وقت
پوچھنا کیا، حساب میں کیا ہے

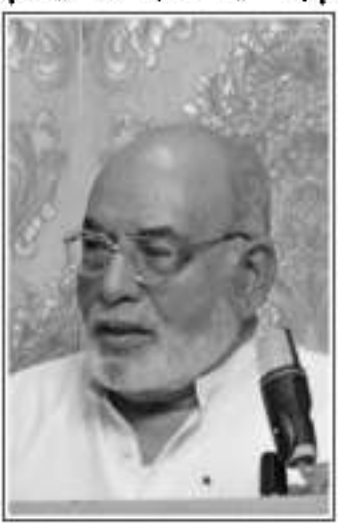

طارق بٹ

داستاں: داغ داغ میں، کیا ہے
کیا کہوں، کس ایاغ میں، کیا ہے

کیا ہے روشن، چراغ سے باہر
جل گیا جو، چراغ میں، کیا ہے

جب نہیں ہے، نظارہ کش کوئی
دشت میں کیا ہے، باغ میں کیا ہے

جو بیک جرعہ ، مست پھرتے ہیں
کیا بتائیں ، ایاغ میں کیا ہے

جلنے والے تو، جل بجھے کب کے
یہ ہَوا اَب، سراغ میں کیا ہے

غزل

جب زمانہ بلا زمانہ تھا
ان دنوں بس خدا زمانہ تھا

میں جہاں تھا نہیں ، تھا وقت وہاں
وہ کوئی دوسرا زمانہ تھا

مشتہر پہلے عشق میں میرے
دوسرے عشق کا زمانہ تھا

اس کی تصویر مسکرائی تھی
پر وہ گزرا ہوا زمانہ تھا

وہ بھی کتنی طویل مدت تھی
میں بھی کتنا بڑا زمانہ تھا

جب مجھے سب سلام کرتے تھے
وہ کسی اور کا زمانہ تھا

جب نہ تھا اس سے اختلافِ رائے
یاد آتا ہے! کیا زمانہ تھا

عمر! برتی ہوئی ضرورت تھی
عشق! ٹوٹا ہوا زمانہ تھا

دوست! ہم کتنے خوبصورت تھے
آئنہ! آئنہ زمانہ تھا

چیخ شرمندہ اس لیے تھی مری
اس میں محسن چھپا زمانہ تھا

محسن اسرار

غزلیں

دل سے خیالِ یار کو یکسر نکال کے
جینے لگے ہیں گردشِ دوراں کو ٹال کے

اے کاش! بات مانتے، آشفتہ حال کی
راہِ وفا میں رکھتے قدم، دیکھ بھال کے

تازہ گلاب بھیج کے، کہتے ہیں اہلِ حسن
نعم البدل نہیں یہ ہمارے جمال کے

دورِ فراق، عرصۂ محشر پہ ہے محیط
چشمِ زدن میں کٹ گئے، لمحے وصال کے

شوکت محمود شوکت

اک نظر جب مہرباں ہونے لگی
زندگی، آرامِ جاں ہونے لگی

موسمِ گل راہ میں ہے اور یاں
آرزوئے دل جواں ہونے لگی

مثلِ صحرا، ہر چمن ہونے لگا
ہر حقیقت، داستاں ہونے لگی

بزمِ مستاں پر ہوا طاری سکوت
صبح دم، جیسے اذاں ہونے لگی

پیغامِ وصلِ یار بھی لایا ہلالِ عید
دیکھے تو کوئی دیکھے، کرشمے ہلال کے

شوکت! اداسیوں کا ہے مسکن مکانِ دل
لیکن، نگاہِ شوق میں ہیں دن کمال کے

نام کیا آیا زباں پر عشق کا
ساری دنیا، نکتہ داں ہونے لگی

جب دلائل، مسترد اپنے ہوئے
خامشی پھر ترجماں ہونے لگی

بات دل کی، دل میں تھی شوکت، مگر
چشمِ پرنم سے عیاں ہونے لگی

غزلیں

کچھ زیادہ میں ضرورت سے کمایا گیا ہوں
اب مسلسل جو خسارے میں دکھایا گیا ہوں

خوشبوئے سبز گماں! چھو کے گزر تُو مجھ کو
زرد ہوتے ہوئے منظر میں بسایا گیا ہوں

میری شاخوں نے تو کر دی تھی زمیں پر چھاؤں
میں کہیں ضبط کے گملے میں اُگایا گیا ہوں

نجم و مہتاب کو رکھا گیا مٹی میں مری
میں اندھیرے سے کسی نور میں لایا گیا ہوں

میری بنیاد ہی نقشے کے مطابق نہیں تھی
اپنی تکمیل سے کچھ پہلے گرایا گیا ہوں

کتنی مشکل سے میسّر میں ہوا تھا اُس کو
کتنی آسانی سے طاہر میں گنوایا گیا ہوں

قیوم طاہر

میں نہیں اپنی جگہ، تُو اپنی جا ہوتا نہیں
رہروانِ ریگ ہیں ہم، نقشِ پا ہوتا نہیں

تم کو ست و خواب کی جھلمل سے کیا حاصل ہوا
دائرہ ہے، دائرے میں زاویہ ہوتا نہیں

وہ جدائی کی بجاتا ہے مسلسل سیٹیاں
کھول بھی دیتا ہے پنجرہ، میں رہا ہوتا نہیں

میں، کہ بکھری ریت سے پتھر بناتا ہوں ابھی
عشق میں پورے کا پورا مبتلا ہوتا نہیں

روز ملتے ہیں کشادہ بازوؤں کے ساتھ ہم
لمس و خوشبوئے بدن سے رابطہ ہوتا نہیں

اس کے بنجر پن سے کیا ہے، اس کی زرخیزی سے کیا
میری مٹی ہے، مجھے اس سے گلہ ہوتا نہیں

حرف اوّل کا تکلف ابتدائے عشق میں
بعد میں تو گفتگو میں مسئلہ ہوتا نہیں

غزل

ذرا سا ہوش کہ پتھر بھی ساتھ چلتے ہیں
جو ڈگمگا کے گریں کب یہاں سنبھلتے ہیں

گھٹائیں گھیرے ہوئے ہیں چہار سمتوں سے
ہماری بستی میں دن کو چراغ جلتے ہیں

چراغ بجھنے سے اک بات یاد آتی ہے
کہ لوگ کیسے وفاداریاں بدلتے ہیں

نہ ان کے مشرق و مغرب نہ ہیں شمال و جنوب
ترے فریب کے سورج کہاں پہ ڈھلتے ہیں

کسی کی یاد میں تھوڑا سا درد شامل ہو
گلوں کو چھوڑ کے زخموں کو ہم مسلتے ہیں

میاں یہ شہر ہے اور شہر کی روایت ہے
گھروں سے لوگ یہاں رات کو نکلتے ہیں

یہ اور بات کہ ہم بولنے سے قاصر ہیں
دلوں میں آج بھی نغمے کئی مچلتے ہیں

میں اپنے بازو نہیں کھولتا کبھی اقبال
ہزار سانپ مری آستیں میں پلتے ہیں

اقبال سروبہ

غزلیں

چھپانے کے لیے فی الحال تو سر کی ضرورت ہے
کہاں خانہ بدوشوں کو کسی گھر کی ضرورت ہے

سراسر خیر سے یہ دنیا داری چل نہیں سکتی
طبیعت میں شر رتو ہے مگر شر کی ضرورت ہے

ضروری تو نہیں ہر بات کا مطلب نکل آئے
اڑانے کے لیے اک آدھ بے پر کی ضرورت ہے

ہم اس دیوار سے اب اور کتنی بار کودیں گے
کبھی تو آنے جانے کے لیے در کی ضرورت ہے

وہ پتھر دل بہر صورت ہمارے کام آیا تو
ہمارے مقبرے کو سنگ مرمر کی ضرورت ہے

کہیں ایسا نہ ہو بالکل ہی قابو سے نکل جائے
مری دیدہ دلیری کو کسی ڈر کی ضرورت ہے

انہیں بھی جنگلوں میں ناچنا اچھا نہیں لگتا
اب ان موروں کو فوری طور پر تھر کی ضرورت ہے

مسعود احمد

وہ سرکشی وہ رعونت نچوڑ دی میں نے
قلم اٹھایا تو تلوار توڑ دی میں نے

میں ایسے کیسے محبت کو چھوڑ سکتا تھا
اسی لیے تو یہ دنیا ہی چھوڑ دی میں نے

دیا ہوا کے مقابل جلا کے ایسے لگا
کہ جیسے ٹوٹی ہوی سانس جوڑ دی میں نے

بھلا میں کیسے تری بات موڑ سکتا تھا
یہ کس طرح سے تری بات موڑ دی میں نے

وہ آئے روز مجھے آئینہ دکھاتی رہی
پھر ایک روز وہی آنکھ پھوڑ دی میں نے

مرے لیے تری آنکھوں میں خون کیا۔ اترا
ترے حضور میں رگ رگ نچوڑ دی میں نے

اے کائنات مرے ہاتھ کیوں نہیں آتی
تمہاری کون سی یہ کل مروڑ دی میں نے

غزلیں

کیا ہی دن تھے جب ہمارے نقشِ پا بھی تھے سراج
تھا سروں پر جب ہمارے عظمتِ انساں کا تاج

ہم غریبِ شہر ہیں لُطفِ امیرِ شہر سے
ہائے کیوں جینے نہیں دیتا ہمیں ظالم سماج

بے حسی کا دور دورہ ہے ہمارے شہر میں
آج کل دلہن سے پیارا زر پرستوں کو ہے داج

عالمِ فاقہ کشی میں مر گئی اِنسانیت
ظالموں کو ظلم کرنے پر بھی ملتا ہے خراج

ڈگریوں کو دیکھ کر تو بھوک مٹ سکتی نہیں
کاش مل جائے ہمیں بے روزگاری کا علاج

آج بھی دستارِ ملت غیر کے قدموں میں ہے
آج بھی کاسہ بدستوں پر ہے کافر کا ہی راج

گھر سحرؔ زرخیز کھیتوں میں بنانا چھوڑ دو
ورنہ چھت پر رکھے گملوں میں اُگاؤ گے اَناج

اکرم سحر فارانی

جب سے ہے اِس شور و شر میں حُسن کا شہکار چُپ
آرزو خاموش ہے گھر کے در و دیوار چُپ

غم کے مارے بے بسوں نے لاکھ بدلیں کروٹیں
جبر نے رکھا مگر فریاد کو ہر بار چُپ

بند اَب دن رات رہتے ہیں دریچے حُسن کے
مصلحت کی اوٹ میں ہیں طالبِ دیدار چُپ

دل کے بدلے دل ہی مانگا ہے عنایت کیجئے
اِس ذرا سی بات پر کیوں ہو گئے سرکار چُپ

ظلم ہوتا دیکھتے ہیں بولتا کوئی نہیں
بے حسی اوڑھے ہوئے ہیں آج کل غمخوار چُپ

منصفی کے در پہ ہے مجروح چیخوں کا ہجوم
ظالموں کے سامنے ہیں پیکرِ گفتار چُپ

دیکھئے انجام کیا ہو اِس خموشی کا سحرؔ
دار کے موسم میں ہیں سب صاحبِ کردار چُپ

غزل

کوئی جگنو کوئی دیپک کہیں جلتا تو رہے
دیکھ کے جن کو مسافر کوئی چلتا تو رہے

رہنما ہم نہ سہی اور کوئی بن جائے
دوستو ! سوچ کا یہ قافلہ چلتا تو رہے

وہ تمناؤں کی خوشبو ہے تو بکھرے دل میں
وہ اگر درد ہے پھر سینے میں پلتا تو رہے

ایک مدت سے ہیں ویران گلابوں کے نگر
کوئی موسم کبھی منظر کو بدلتا تو رہے

کاش ایسا بھی کوئی معجزہ برپا ہو یہاں
شام کے بعد بھی سورج کوئی جلتا تو رہے

اتنا احساس تو ہر ایک کے ہو پاس یہاں
چشمِ نم دیکھ کے دل درد میں ڈھلتا تو رہے

دسترس سے رہے چاہے وہ مری دور جلیل
اس کو پانے کے لئے دل یہ مچلتا تو رہے

احمد جلیل

غزلیں

پردے پڑے ہوئے تھے کچھ ایسے نگاہ پر
سو مرحلوں سے ہو کے ہم آئے ہیں راہ پر

اے زندگی فریبِ سماوات میں نہ آ
ایمان رکھ زمیں کے سفید و سیاہ پر

بے خوف ہو کے آج تو صدیوں کے ریزہ چیں
آبائی کاسہ پھوڑ سرِ کج کلاہ پر

الزام کیا لگائے وہ ابلیس پر بھلا
اکسا رہے ہوں جس کو فرشتے گناہ پر

خود اٹھتے جھکتے رہتے ہیں پلڑے ہوا کیساتھ
میزاں کا انحصار نہیں ہے گواہ پر

ان سے کھرے سخن کی توقع فضول ہے
ہر وقت لوٹ پوٹ ہوں جو واہ واہ پر

پرواز کیا بڑھی کہ کشش بڑھ گئی شہاب
مجھ سے نہیں سنبھلتے مرے بے پناہ پر

شہاب صفدر

جو قیدِ جبر کی تکلیف کم نہیں کرتا
تو اختیار اسے محترم نہیں کرتا

ہوا کا لمس کہانی کوئی سناتا ہے
کسی کلی کی مگر آنکھ نم نہیں کرتا

بگاڑ دیتے ہیں سب کھیل غیبی کارندے
دل اس طرف جو نظر کوئی دم نہیں کرتا

اٹھانا پڑتی ہے پھر تیغ سر اتارنے کو
کہ باپ جہل کا پاسِ قلم نہیں کرتا

وسیع حلقۂ سقراط ہوتا جاتا ہے
نوائے حق پہ اثر کوئی سم نہیں کرتا

غبار اڑتا ہے ان خشک لب زمینوں میں
گزر جہاں سے وہ ابرِ کرم نہیں کرتا

شہاب کرتا ہوں تحریر اپنے محسوسات
اِدھر اُدھر کے فسانے رقم نہیں کرتا

غزلیں

جو میرے دل پہ یہ اِک اضطرابی کیفیت ہے
سوالوں پر سوالوں سے جوابی کیفیت ہے

یہاں گڑیال سارے اپنے منہ کھولے کھڑے ہیں
مرے پیارے وطن پر انتخابی کیفیت ہے

عجب سی دھند ہے منظر میں کوئی خواب ہے یا
مری آنکھیں غلط ہیں اور سرابی کیفیت ہے

ترازو توڑ کر بیٹھے ہیں سودا تولنے کو
تبھی فصلوں کی فصلوں پر عذابی کیفیت ہے

تمہیں دیکھا ہے جب سے میں نے غزلیں کہہ رہی ہوں
مرے قلب و نظر پر کیا کتابی کیفیت ہے

جدھر جاتی ہے دنیا دل نہیں جاتا اُدھر کو
کئی دن سے مرے دل پر وہابی کیفیت ہے

میں تکیے پر تخیّل کے، دھرے سر کو پڑی ہوں
کیا کچھ بھی نہیں کیونکہ نوابی کیفیت ہے

شبہ طراز

نیا نہیں مرا رشتہ بہت پرانا ہے
اگرچہ درمیاں دونوں کے اِک زمانہ ہے

یہ شعر گوئی ، تغزّل ، یہ قافیہ بندی
سب ایک ہجرِ مسلسل کا شاخسانہ ہے

زمین پر تو یونہی آتی جاتی رہتی ہوں
فلک کے دوسری جانب مرا ٹھکانہ ہے

کوئی بتاتا نہیں اُس طرف ہے کیا آخر
جسے بھی دیکھیے وہ اُس طرف روانہ ہے

یہ رنگ و نور کی بارش ہے ظاہری مظہر
یا میری آنکھ تحیّر کا کارخانہ ہے

قدم قدم پہ ہے خطرہ اسے چھلکنے کا
گلی گزرنا بھی ، پیمانہ بھی بچانا ہے

غزل

یہ جو مجھ میں خراب آدمی ہے
خلق میں انتخاب آدمی ہے

کچھ نہیں ہے سوائے مٹی کے
بس ہوا ہے ، حباب آدمی ہے

یہ الگ بات ، ہے اندھیروں میں
ورنہ اِک آفتاب آدمی ہے

کاٹنے آیا زندگی کی سزا
غم کے زیرِ عتاب آدمی ہے

پہلے جنت کو کر دیا ناپاک
اب زمیں پر عذاب آدمی ہے

جس کے دامن میں خار ہوتے ہیں
ایک ایسا گلاب آدمی ہے

بسترِ خاک پر جو سوتا ہو
بس وہی بُو تراب آدمی ہے

آئنے کو جو دھوکہ دے جائے
اِک وہی کامیاب آدمی ہے

جس میں انسانیت نہیں اشرف
اب وہ عزت مآب آدمی ہے

اشرف نقوی

غزل

میتھیو محسن

حدیث غم تو کہیں مختصر نہیں ہوتی
مگر کسی پہ بھی کیوں کارگر نہیں ہوتی

یہ آشنائی تو مبنی ہے دل کے موسم پر
جہاں وہ ہوتے ہیں سب کو خبر نہیں ہوتی

کسی کمال تک اُس کی رسائی کیسے ہو
وہ جس پہ تیرے کرم کی نظر نہیں ہوتی

بجا کہ ہم بھی تو دو جسم ایک دل ہیں مگر
اس اپنے رز کی مجھی کو خبر نہیں ہوتی

یہ موت ہنستی رہی مجھ پہ میرے مٹنے تک
کہ زیست پیشگی غم میں بسر نہیں ہوتی

کبھی نہ داد ملی اس سلیقے کی محسن
کہ رو رہے ہیں مگر چشم تر نہیں ہوتی

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

خاک پر خاک کی ڈھیریاں رہ گئیں
آدمی اُٹھ گئے ، نیکیاں رہ گئیں

غزل

جو نہ کرنا تھا کر گئے صاحب
ہم محبت سے ڈر گئے صاحب

سانس لیتے ہیں عادتاً ورنہ
لوگ اندر سے مر گئے صاحب

بے گھری راستے دکھاتی رہی
کون کہتا ہے گھر گئے صاحب

شہر خالی ہے دِل بھی خالی ہے
خواب میرے کِدھر گئے صاحب

وہ جو وارث تھے ان زمینوں کے
چھوڑ کر کس نگر گئے صاحب

وہ جو قول و قرار تھے فرحت
ہم بھی ان سے مُکر گئے صاحب

فرحت زاہد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس نے بسایا شہر ہمارا
ظلم کی اینٹیں ، جبر کا گارا

غزلیں

خود پسندی سے خود پرستی تک
آ گئے لوگ کتنی پستی تک

بک رہی ہے ہر ایک چیز یہاں
آنکھ سے گیسوؤں کی مستی تک

کیسا سچ ہے کہ مجرموں کا سراغ
آن پہنچا ہے میری بستی تک

دیکھ کر آپ کو کمان بدست
تاک پر رکھ دی ہم نے ہستی تک

ہم نے رکھا ہے زندگی کا بھرم
خوش نصیبی سے تنگ دستی تک

محمد شفیق

مرے جذبے صداقت بن گئے ہیں
وفاؤں کی حکایت بن گئے ہیں

منانے آ گئے ہیں لوگ کیا کیا
کہ جیسے ہم روایت بن گئے ہیں

مری پہچان ہوتی جا رہی ہے
مرے نغمے سفارت بن گئے ہیں

سحر کے خواب بُنتا جا رہا ہوں
کئی لمحے حقیقت بن گئے ہیں

قصیدے لکھ رہے ہیں اہلِ دانش
ترانے بھی تجارت بن گئے ہیں

تمھارے شہر کے سب پستہ قامت
بلندی کی ضمانت بن گئے ہیں

غزل

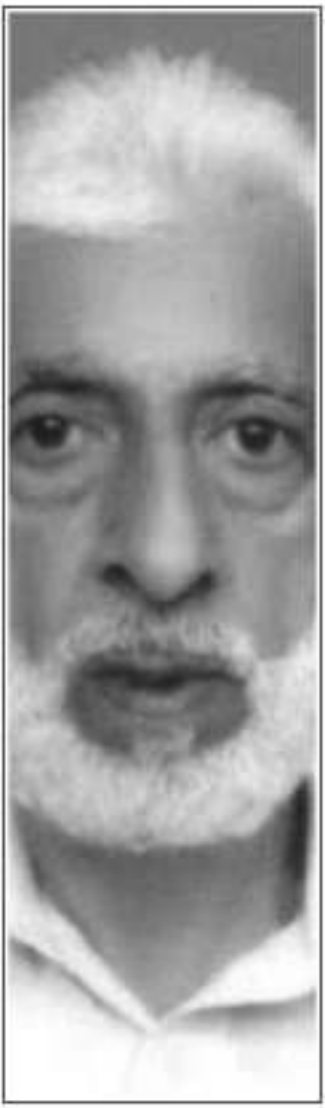

سبق جو ماں نے دیا ہے نہ میں بُھلاؤں گا
کسی کا درد مٹا کے ہی مُسکراؤں گا

نجف تلک میں یقیناً پہنچ کے دم لوں گا
علیؑ کی یاد میں آنسو اگر بہاؤں گا

تُو اپنے جلوے دکھانے کا بندوبست تو کر
میں تیرے در پہ ان آنکھوں کو چھوڑ آؤں گا

نظر نہ آئے گا جب تک نشان منزل کا
میں ایک پل نہ رکوں گا میں چلتا جاؤں گا

ترازُو سیدھا جو رکھتا ہے ڈگمگاتا نہیں
یقین رکھو میں منصف اُسے بناؤں گا

تو کیوں روشنی ہو گی سبھی کے آنگن میں
محبتوں کے جو گھر گھر دیے جلاؤں گا

ہزار بھیجوں گا خود پہ میں لعنتیں شاہد
میں محسنوں پہ اگر اُنگلیاں اُٹھاؤں گا

ہمایوں پرویز شاہد

غزل

اک اشک تھا جو آنکھ کی کھڑکی سے گر پڑا
میں رات اپنے خواب کی سیڑھی سے گر پڑا

اک لفظ میری گونگی زباں سے پھسل گیا
اک پھول احتیاط کی ٹہنی سے گر پڑا

پھر یوں ہوا کہ جھیل نے آغوش کھول دی
اک چاند آسماں کی ہتھیلی سے گر پڑا

میں بھی دعا کے پھول روانہ نہ کر سکا
وہ بھی مرے نصیب کی تھالی سے گر پڑا

شاہد غزل کے دیوتا ناراض ہو گئے
اک حرف میرے شعر کی ڈالی سے گر پڑا

افتخار شاہد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خوبیاں ناقدِ فن کیوں دیکھے
دشت کی آنکھ چمن کیوں دیکھے

غزلیں

نہ جانے پانی کی رہتی ہے کیوں کمی مجھ میں
ان آنسوؤں کی کبھی جذب ہو نمی مجھ میں

اب ایک جیسا ہی لگتا ہے دونوں کا احساس
کچھ ایسے یکجا ہوئی ہے غمی خوشی مجھ میں

اِسے مٹانے میں نفرت نہ میرے کام آئی
یہ کیسی پختہ محبت سی ہے جمی مجھ میں

ہر ایک درد کا کرتی ہوں نفسیاتی علاج
تو ٹھنڈی پڑنے لگی خود سے برہمی مجھ میں

کسی مقام پہ شاید گھڑی کی چھوٹی سوئی
صدا اسی کی ہے ٹک ٹک کہیں تھمی مجھ میں

اِسی طرح سے ہوئی جا کے ذات کی تکمیل
تو دیکھتا ہے ہر اک بار کچھ کمی مجھ میں

رخشندہ نوید

رقص کناں اشعار کی پریاں محو تھیں بزم سجانے میں
چاند بھی اپنی کنجی رکھ کے بھول گیا انجانے میں

ہم دونوں کی خوشیوں کا تانا بانا کہیں ملتا ہے
تری نظر کے رنگ ہیں شامل شوخ کو شوخ بنانے میں

آئینہ آنکھوں آنکھوں میں یہ سمجھاتا رہتا ہے
گیسو کاجل بھی ساماں ہیں راہ و رسم بڑھانے میں

اُڑنے کی خواہش رکھتی ہوں لیکن اُڑ نہیں پاتی ہوں
دیر مجھے کچھ ہو جاتی ہے سمٹے پر پھیلانے میں

رخشندہ جی کس کافر کا قابو تھا دل پر لیکن
کتنے ضبط سے کام لیا تھا بزم سے اُٹھ کر جانے میں

غزل

غصے کی اور بات ہے ، غصہ نکالئے
لیکن یہ خد و خال یہ تیور سنبھالئے

تیغ و تفنگ و تیر سے لڑنا محال تھا
اچھا کیا جو آپ نے ناخن بڑھا لئے

خدمت گزاریوں میں مری عمر کٹ گئی
حضرت مرے خلاف عداوت نہ پالئے

جس نے لہو کا ایک بھی قطرہ نہیں دیا
تمغے اسی نے آج بھی سارے سجا لئے

لوگوں نے میرے صحن کو اپنا سمجھ لیا
''لوگوں نے میرے صحن میں رستے بنا لیے''

گاؤں کے نابکار کو اچھا نہیں لگا
میں نے جو آ کے شہر میں بچے پڑھا لئے

طاقت وروں نے آج عدالت خرید لی
طاقت وروں نے جیل سے مجرم چھڑا لئے

انصر جو گر گئے تھے سرِ دشتِ کربلا
ہم نے بصد خلوص وہ پرچم اٹھا لئے

انصر حسن

غزل

جانتا ہوں پاس میرے اب رہا کچھ بھی نہیں
اور اگر کچھ ہے تو یادوں کے سوا کچھ بھی نہیں

میرے دل کی کیفیت سے آشنا ہے وہ مگر
میرے ہونٹوں پر اگرچہ مدعا کچھ بھی نہیں

گردشِ حالات نے دونوں کو کر ڈالا جدا
اب تعلق ہے نہ ان سے رابطہ کچھ بھی نہیں

چھین کر مجھ سے مری تنہائیوں کا بانکپن
پوچھتے ہیں مجھ سے وہ جیسے ہوا کچھ بھی نہیں

تم ہمارے ساتھ تھے تو زندگی پر کیف تھی
اب تمہارے بعد جینے کا مزا کچھ بھی نہیں

گلشنِ امید ہی جیسے اجڑ کر رہ گیا
اب نہ چڑیاں ہیں نہ کوئی فاختہ کچھ بھی نہیں

ہم نے جب دانش کیا آغازِ الفت تب کھلا
عشق میں سب کچھ روا ہے ناروا کچھ بھی نہیں

اعجاز دانش

غزل

آنکھیں ہونے کو ہیں بے جان مجھے رونے دے
میری آنکھوں کے نگہبان مجھے رونے دے

تیرا احسان کہ زندہ ہیں ابھی تک آنکھیں
کر دے اک اور بھی احسان مجھے رونے دے

دیکھ لینے دے مجھے ایک نظر پیاروں کو
چند لمحوں کا ہوں مہمان مجھے رونے دے

بے مروت نہ سمجھ لیں مجھے رونے والے
میری تکلیف کو پہچان مجھے رونے دے

مجھ کو درکار ہے نم ایک پلک بھیگنے تک
اے مرے چشمۂ امکان مجھے رونے دے

میں کہاں جاؤں گا اشکوں بھری آنکھیں لے کر
دان کرنا ہے یہ تاوان مجھے رونے دے

زندگی آنکھ کی پتلی میں ذرا دیر کو ہے
اشک بن جائیں نہ طوفان مجھے رونے دے

جان کچھ دیر کو اٹکی ہے مری آنکھوں میں
ضبط کرتا ہے پریشان مجھے رونے دے

زیست! تو نے مجھے پتھر کا بنا ڈالا ہے
منزلیں کر میری آسان مجھے رونے دے

رانا سعید دوشی

غزل

مری ہستی میں فن بھرنے نہ دے گا
یہ بھوکا پیٹ کچھ کرنے نہ دے گا

میں ہر چوکھٹ پہ سجدہ کیسے کرلوں
وہ اپنے در پہ سر دھرنے نہ دے گا

لگاتا ہی رہے گا روز نشتر
وہ دل کے زخم کو بھرنے نہ دے گا

خدا کا خوف پیدا کر لو دل میں
وہ اس دنیا سے پھر ڈرنے نہ دے گا

فنا جب تک نہ دنیا ہوگی جاناں
قلم میرا تجھے مرنے نہ دے گا

ہمارا عہد حیوانات کو بھی
کسی کے کھیت میں چرنے نہ دے گا

لے، دیوانہ ترا کاندھوں پہ نکلا
ترے کوچے میں اب دھرنے نہ دے گا

تو اس ظالم کے چنگل میں پھنسا ہے
تجھے جینے تو کیا مرنے نہ دے گا

جتا کر گا ہے گا ہے مجھ سے نفرت
محبت سے وہ دل بھرنے نہ دے گا

ذکی طارق

غزل

برنگِ مہر یہاں مہرباں سے آئے ہیں
عدو صفت ہیں صفِ دوستاں سے آئے ہیں

یقین جانیے دل سے نہ جاں سے آئے ہیں
کرائے پر ہیں غرض کی دکاں سے آئے ہیں

مرے چمن کی بہاروں کو لوٹنے والے
یہ شر پسند عناصر کہاں سے آئے ہیں

یہ توڑ پھوڑ کے شیدائی، من کے سودائی
یہ کون لوگ ہیں کس کارواں سے آئے ہیں

بدن کے گھاؤ سبھی بھر گئے ہیں وقت کے ساتھ
مگر جو زخم تمھاری زباں سے آئے ہیں

جہاں پہنچ کے پلٹنا محال ہوتا ہے
کسی دعا سے پلٹ کے وہاں سے آئے ہیں

یہ رسم اِن سے کچھ آگے نظر نہیں آتی
سروں پہ جن کے دوپٹے اذاں سے آئے ہیں

انھیں میں دل سے نکالوں تو بے مزہ ہو جاؤں
جو تیر طنز کے شیریں لباں سے آئے ہیں

یہ کیسی بات ہے مانے نہ مانے دل نازش
پلٹ کے جانا وہیں ہے جہاں سے آئے ہیں

شبیر نازش

غزل

دریا بھی نہیں خواب میں صحرا بھی نہیں ہے
سیراب نہیں دل تو یہ پیاسا بھی نہیں ہے

مایوسی ہی اچھی ہے نہ خوش فہمی زیادہ
یہ وقت برا بھی نہیں اچھا بھی نہیں ہے

تم نفع و نقصان سے آگے اسے سوچو
اک پھول نہیں ہے تو وہ کانٹا بھی نہیں ہے

جو چاہو بنا لاؤ کہانی کوئی اس پر
اس کو تو کسی شخص نے دیکھا بھی نہیں ہے

پانی کی طرح جیسے بہایا گیا اس کو
سستا نہیں یہ خون تو مہنگا بھی نہیں ہے

کوشش تو بہت کی ہے مگر بات ہماری
بہرا بھی نہیں اور وہ سنتا بھی نہیں ہے

یہ شخص عجب شخص ہے شاعر ترا کیفی
محفل کا بھی خوگر نہیں تنہا بھی نہیں ہے

محمود کیفی

غزل

اس کو اپنا حال سنایا جا سکتا ہے
دل کا کیا ہے دل بہلایا جا سکتا ہے

تاروں سے بھی شب بھر باتیں ہو سکتی ہیں
پلکوں پر اک اشک سجایا جا سکتا ہے

جس نے میری آنکھیں خوابوں سے بھر دی ہیں
اس کا ہر احسان اٹھایا جا سکتا ہے

شیشہ توڑ کے اپنے گھر کی خاموشی کو
جب چاہیں آواز بنایا جا سکتا ہے

جس کا نام محبت رکھا ہے سب نے
وہ نغمہ ہر ساز پہ گایا جا سکتا ہے

ان کے اندر چند دریچے بن جائیں تو
دیواروں کا درد ہٹایا جا سکتا ہے

بات بنانے کا فن آتا ہو تو شوکت
پتھر میں بھی پھول کھلایا جا سکتا ہے

افتخار شوکت

غزل

گھٹا کی موج رواں ہے سیاہ بالوں میں
شبِ سیہ کا دُھواں ہے سیاہ بالوں میں

وہ آج چھت پہ جو آیا ہے کھول کر گیسُو
سیاہی خوب عیاں ہے سیاہ بالوں میں

کوئی لٹوں کو اگر دیکھ لے گُماں ہو گا
کہ جیسے ناگ جواں ہے سیاہ بالوں میں

گھُلی ہوئی فضا میں لطیف سی خوشبو
کہ جیسے عِطرِ گُلاں ہے سیاہ بالوں میں

ٹپک رہی ہے جو زلفوں سے بھیگتی سرگم
خُمارِ آبِ رواں ہے سیاہ بالوں میں

زبانِ شوق نے قصّے بہت بیان کیے
مگر جو طرزِ بیاں ہے سیاہ بالوں میں

مجھے ہُوا ہے یہ اندازہ نرگی چھُو کر
گُدازِ عشقِ بتاں ہے سیاہ بالوں میں

یہ تیرگی تو اماوس میں بھی نہیں مِلتی
شبیہِ ماہِ نہاں ہے سیاہ بالوں میں

ہیں کس کے دستِ مقدر میں ریشمی سائے
یقین ہے نہ گُماں ہے سیاہ بالوں میں

ہر ایک رُخ سے مکمل شباب ہے اِن کا
کمی ہی کوئی کہاں ہے سیاہ بالوں میں

لِپٹ گیا ہے اچانک ہی آفتاب اِن سے
تو سنسنی کا سماں ہے سیاہ بالوں میں

آفتاب خان

غزل

جب مرے شہر کے رستے سے گزرتا ہوگا
مجھ کو بھولے سے کبھی یاد تو کرتا ہوگا

سامنے بیٹھ کے جب جب وہ سنورتا ہوا
آئنہ اس سے مرا ذکر تو کرتا ہوگا

ایک میں ہوں کہ بنائے سے نہیں بنتی صورت
ایک وہ ہے کہ جو ہر روز سنورتا ہوگا

ایک میں ہی وہاں موجود نہیں ہوں ورنہ
چاند اب بھی ترے آنگن میں اترتا ہوگا

کتنی آنکھیں ترے جلووں سے چمکتی ہوں گی
جب بھی سورج ترے تری بستی سے گزرتا ہوگا

عکس در عکس جو بکھرا ہے ترے قدموں میں
خواہشِ دید میں خود چاند اترتا ہوگا

تو گیا ہے تو ترے بعد وہ خالی گھر کو
رات بھر خواب کے سامان سے بھرتا ہوگا

ایک شاعر ہے کہ جو عمر کے پیمانے میں
تیری یادوں سے شب و روز کو بھرتا ہوگا

میں بھی اب یاد نہیں کرتا اسے مدت سے
وہ بھی اب اور کسی شخص پہ مرتا ہوگا

اشرف کمال

غزل

مدد کریں یہاں کس سے طلب گرے ہوئے لوگ
یہاں تو حدِ نگہ تک ہیں اب گرے ہوئے لوگ

کوئی نظر کوئی معیار سے گرا ہوا ہے
ہمارے چاروں طرف ہیں عجب گرے ہوئے لوگ

تنزلی کی کوئی انتہا بھی ہے کہ نہیں
مزید کتنا گریں گے یہ سب گرے ہوئے لوگ

عجیب لگتی ہے ایسے میں خود اٹھان اپنی
جگہ جگہ نظر آتے ہیں جب گرے ہوئے لوگ

تمھارے لوگ بھی کچھ کم نہیں گراوٹ میں
مگر ہیں لوگ ہمارے غضب گرے ہوئے لوگ

گرے جو نظروں سے، مردُم شماری ہو ان کی
پتہ چلے کہ ہیں کتنے ارب گرے ہوئے لوگ

پڑے ہیں نیند کی کھائی میں اوندھے منہ اب تک
نہ جانے خواب سے اٹھیں گے کب گرے ہوئے لوگ

ادب ادیب کی حالت کا عکس ہوتا ہے
گرا ہوا ہی لکھیں گے ادب گرے ہوئے لوگ

کبھی یہ شعبہء دنیا تھا اچھے ہاتھوں میں
نظام اس کا چلاتے ہیں اب گرے ہوئے لوگ

اُس ایک شخص میں کوئی تو بات ہے آخر
لگے ہیں جس کو گرانے میں سب گرے ہوئے لوگ

جو چل کے دیکھو تو لغزش کا سلسلہ ہے دراز
ملیں گے تم کو عجم تا عرب گرے ہوئے لوگ

نشانی دیکھ کے سجدے میں گر گئے شاہد
بلند مرتبہ ہیں پیشِ رب گرے ہوئے لوگ

شاہد ماکلی

غزلیں

جلتا بجھتا دیپ سہارا کافی ہے
رات فلک پر ایک ستارا کافی ہے

درد سمندر کے اس ڈونگھے پانی میں
دور کہیں پر آس کنارا کافی ہے

دل والے بس کام محبت کرتے ہیں
گو کہ اس میں مال خسارا کافی ہے

رات ستم کی پل دو پل کی بات نہیں
جتنا ہم نے وقت گزارا کافی ہے

اور سکندر مانگوں کیا بن تیرے میں
مل جائے گر ساتھ تمہارا کافی ہے

مرزا سکندر بیگ

طوق ڈال کر گلے میں اسیر مل گئے
بے ضمیر شخص کو بے ضمیر مل گئے

لوگ تھے جدا جدا مختلف مزاج کے
ایک چاک پر سبھی کے خمیر مل گئے

میں چلا کسی وفا دار کی تلاش میں
خاک سے نکل نکل کر حقیر مل گئے

چھوڑ کر چلے گئے لالچی حریص جب
زندگی میں آدمی بے نظیر مل گئے

رات دے گئی ستارا نما دیا کوئی
راہ میں سخی سکندر فقیر مل گئے

غزل

کچھ ایسے دامنِ دل کو کشادہ کر لیا میں نے
کسی سے پھر محبت کا ارادہ کر لیا میں نے

مرے اسباب کو اِک روز تو تقسیم ہونا تھا
سو جو حصے میں آیا آدھا آدھا کر لیا میں نے

جنہوں نے عمر بھر پوچھا نہیں مرنے پہ آئے ہیں
چلو یوں ہی اکٹھا خانوادہ کر لیا میں نے

کوئی بھوکا ملے تو پیٹ بھر کھانا کھلاتا ہوں
کہ اِس دنیا کو اُس دنیا کا جادہ کر لیا میں نے

زمانہ اپنے پیروں میں کچل دیتا مگر اعظم
خدا کا شکر خود کو ایستادہ کر لیا میں نے

اعظم کمال

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پانی اُتر گیا ، مگر آنکھیں بجھا گیا
سیلِ جمال اپنا نشاں تک مٹا گیا

غزل

ارزاں جو بک رہے تھے وہ نایاب کیا ہوئے
رہتے تھے اپنے خوں سے جو شاداب کیا ہوئے

وہ آسمان کھا گیا ان کو کہ یہ زمیں
آنکھوں میں جو سجے تھے کبھی خواب کیا ہوئے

مدت سے ہم ہیں جن کے چمکنے کے منتظر
قسمت کے وہ ستارے وہ مہتاب کیا ہوئے

یہ کیسا موڑ مڑ گیا افسانۂ حیات
لکھنے تھے وہ ہمیں جو ابھی باب کیا ہوئے

ہر دکھ پہ خندگی کا سلیقہ کہاں گیا
ہر غم کو سہنے والے وہ اعصاب کیا ہوئے

منظر بدل گیا تو سبھی کچھ بدل گیا
پل بھر نہ دور رہتے تھے، احباب کیا ہوئے

لمحے میں ریگزار ہوا دل کا گلستاں
پلکوں میں جو چھپے تھے وہ سیلاب کیا ہوئے

پلٹی نہ پھر کبھی بھی ترے غم کی بازگشت
ہم جن کے دیکھنے کو تھے بیتاب کیا ہوئے

کیا کیا نہ تھا دلوں میں کہ فردا ہو کس طرح
تزئینِ آشیاں کے وہ اسباب کیا ہوئے

محمد افضال انجم

غزل

نور دل کا جائے گا مسکان جائے گی ضرور
دور اب تم سے رہا تو جان جائے گی ضرور

پاؤں چھو لے گا اگر تو اس کے جا کر ایک بار
ماں تو پھر ماں ہے ترے قربان جائے گی ضرور

دل میں اپنے رکھ محبت اور تو ملنا بھی رکھ
دل کا تیرے مدعا وہ جان جائے گی ضرور

بچپنے کی چوٹ کا گہرا نشان ماتھے پہ ہے
وہ اگر جب بھی ملی پہچان جائے گی ضرور

زندگی پر اختیارِ مرگ کا غلبہ ہو جب
کس کے روکے سے رکی نادان جائے گی ضرور

صدقِ دل سے مان لے سارے قصور اس کے حضور
اس طرح کرنے سے جھوٹی شان جائے گی ضرور

باندھ لے پختہ ارادہ اہتمامِ عشق کا
اک نہ اک دن عابدی وہ جان جائے گی ضرور

علی حسین عابدی

غزل

آتی نہیں کسی سے شناسائی کی مہک
رچ بس گئی ہے روح میں تنہائی کی مہک

ہر دم سُلگتے ہجر کا اپنا ہی رنگ ہے
مہکا رہی ہے درد کی گہرائی کی مہک

ٹُوٹے کبھی جو ضبط کا بندھن تو کچھ کُھلے
ہوتی ہے کس طرح کی شکیبائی کی مہک

پھر اشتیاقِ بخیہ گری ہے عروج پر
ہر زخم کُھل کے چاہے مسیحائی کی مہک

سانسوں کا سلسلہ ہے مہکتا ہوا امر
جب تک کُھلی فضا میں ہے ہرجائی کی مہک

امر مہکی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کیسی ٹھنڈی ہوا چلی خالد
چاند کیا ، جَل بجھے ستارے بھی

غزل

سمیر اور کوئی داستاں ہماری ہے
فلک ہے اس کا مگر کہکشاں ہماری ہے

مکاں کسی کا ہے اس میں مقیم ہے کوئی اور
یہ دل تمہارا ہے لیکن یہ جاں ہماری ہے

نہ حرف و لفظ پرکھنا مری کہانی کے
ہیں گرچہ لفظ پرائے زباں ہماری ہے

دل و نظر تھے اثاثہ سو ان کو دان کیے
وگرنہ زیست تو یہ رائگاں ہماری ہے

نہ اختیار ہے اشفاق اب کوئی خود پر
یہ دل ہمارا کہاں' جاں کہاں ہماری ہے!

محمد اشفاق بیگ

کوئی مجھے سنوار رہا ہے تراش کر
پتھر کے پاس تیشہ بکف کون آ گیا

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

غزل

ہم پاس تھے مگر کبھی باہم نہیں ہوئے
تصویر میں جو فاصلے تھے کم نہیں ہوئے

یہ زندگی کی جنگ جو ہارے ہیں عمر بھر
یہ اس لیے ہوا کہ وہ ہمدم نہیں ہوئے

ان کی ہنسی بہار ہے ، پلکیں اٹھانا دھوپ
بے اختیار یوں کبھی موسم نہیں ہوئے

اس کے ستم تمام ہنسی میں اڑا دیئے
مشکل میں ہم سپرد رہ غم نہیں ہوئے

اب میرا اختیار تو مجھ پر نہیں رہا
جو اس کو اختیار تھے وہ کم نہیں ہوئے

حاصل ہے عمر بھر کا یہ ہستی مری حبیب
قطرہ بنے تو پانیوں میں ضم نہیں ہوئے

بشیر احمد حبیب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک اک بات تمھیں بتلا دی اب آگے تم جانو
وہ بھی جواب نہیں دیتے ہیں، تم بھی سوال نہ کرنا

غزلیں

کہتے ہیں شرحِ جاں کے آثار رفتہ رفتہ
نکلے گا دل سے دل کا آزار رفتہ رفتہ
دیکھو میاں! یہ کب ہے دو چار دن کا قصہ
بے آبرو ہوئی ہے دستار رفتہ رفتہ
اندر کے شور و شر یا باہر کے شور و شر سے
گردن تک آ گئی ہے تلوار رفتہ رفتہ
دشتِ ستارگاں پر دل کی نگاہ ڈالو
ہو جائیں گے ثوابت سیار رفتہ رفتہ
اپنے وُجود کا بھی جن کو یقیں نہیں تھا
ہونے لگے ہیں وہ بھی بیدار رفتہ رفتہ

نبیل احمد نبیل

ایک لمحہ ہے ترے حُسنِ نظر کا جاگنا
عشق ہے لیکن مسلسل عمر بھر کا جاگنا
زندگی کے چاک پر گردش کو رکھتا ہے رواں
کوزہ گر کے ہاتھ میں شوقِ ہُنر کا جاگنا
دیتا رہتا ہے مرے نم خوردہ خوابوں کی خبر
صبحِ جاں افروز میں اِک برگِ تر کا جاگنا
رفتہ و موجود میں تفریق پیدا کر گیا
شہر کی گلیوں میں اکثر شور و شر کا جاگنا
کر گیا مجھ کو نئی سمتوں کی حیرانی میں گم
منزلِ گم گشتہ سے عزمِ سفر کا جاگنا

کچھ ہم قدم بڑھائیں کچھ تم قدم بڑھاؤ
شاید کہ ٹوٹ جائے دیوار رفتہ رفتہ
اشیائے زندگی سے انساں کی قدر کم ہے
بندش میں جب سے آئے بازار رفتہ رفتہ
ہم نے نبیل سمجھا خود کو قلیل سمجھا
کیسے بڑے، نہ سمجھا، اشجار رفتہ رفتہ

رات کے پچھلے پہر مجھ کو جگا دیتا ہے کیوں؟
میرے سو جانے پہ اک گم نام ڈر کا جاگنا
جسم و جاں کیسے لرز جاتے ہیں زورِ گریہ سے
تم نے کیا دیکھا نہیں دیوار و در کا جاگنا
جو پرندے لوٹ کر شاموں کو گھر آتے نہیں
آنکھ میں رہتا ہے اُن کے بال و پر کا جاگنا
پھر کوئی پُرنم اداسی دے گیا مجھ کو نبیل
صفحۂ دل پر کسی رنگِ اثر کا جاگنا

غزل

دل تو روز سفر میں ہے
لگتا ہے کہ گھر میں ہے

تیری رام کہانی کیا ہے
جب سے چاند نظر میں ہے

جیون ایک پرندے کا بھی
یوں تو بال و پَر میں ہے

چھاؤں جیسی خوبی پیارے
اونچے ایک شجر میں ہے

اُس کا رستہ یاد نہیں اب
وہ جو راہ گزر میں ہے

پھر ''منصور'' چڑھا ہے سولی
ہی بھی ایک خبر میں ہے

شافی تُو بے حال نہ ہو
ہمت خوب بشر میں ہے

عقیل شافی

غزلیں

دو دلوں کا رابطہ اپنی جگہ
درمیاں کا فاصلہ اپنی جگہ

آنسوؤں میں بھیگنا کارِ ثواب
بارشوں میں بھیگنا اپنی جگہ

آسماں پر چاند کا اپنا مقام
اور ہتھیلی پر دیا اپنی جگہ

دیکھنے والے ہیں اُس کے خواب بھی
رتجگوں کا سلسلہ اپنی جگہ

اُس گلی کے موڑ کی اپنی بہار
اُس کا مڑ کر دیکھنا اپنی جگہ

کھو چکے جبران ہم تو راستا
جگنوؤں کا قافلہ اپنی جگہ

وسیم جبران

کیوں دیا تھا سماج پتھر کا
تُو ہی کر اب علاج پتھر کا

ہم ہیں اب بھی غلام پتھر کے
ہم پہ اب بھی ہے راج پتھر کا

تُو نے بویا ہے جو وہ کاٹے گا
اب اُگے گا اناج پتھر کا

ہم نے دل کو بنا لیا پتھر
جب ہُوا ہے رواج پتھر کا

دل ہے لوہے کا اُس کے سینے میں
جس کے سر پر ہے تاج پتھر کا

ان کہی داستاں جو کہہ ڈالی
ہو گیا وہ بھی آج پتھر کا

اُس کا دل بھی تو قرض ہے مجھ پر
مجھ پہ واجب خراج پتھر کا

یہ کرشمہ عجیب ہے جبران
آنکھ شبنم، مزاج پتھر کا

غزلیں

ایک دوجے کے ہم قدم نکلیں
کوئی نکلے نہ نکلے، ہم نکلیں
پوری طاقت سے چیخیں چلائیں
تاکہ سینے کے سارے غم نکلیں
اہل ایمان کو بشارت ہو
اور اہلِ ستم کے دَم نکلیں
توڑ کر بند ضبطِ پیہم کا
بن کے طوفان مثلِ یم نکلیں
جان دینے کا فیصلہ کر لیں
کھا کے اللہ کی قسم نکلیں

لکھیں ہر واقعہ شجاعت کا
سارے سچائی کے قلم نکلیں
آبرو قوم کی بچانے کو
لے کے ہمراہ سب حرم نکلیں
آج لازم ہوا ہے سیّد بھی
کرنے اک داستاں رقم نکلیں

حسن پرویز سیّد

مکر میں سب سے ہوا نام تمہارا آگے
دیکھیں کیا ہوتا ہے انجام تمہارا آگے

جبر سے جھوٹ سے دولت کی فراوانی سے
مٹ سکا کون سا الزام تمہارا آگے

کبھی گزرے تھے ستم کار فرعون و نمرود
ان سے بھی ظلم ہے دو گام تمہارا آگے

اپنوں پر سختیاں غیروں کے لئے جھک جانا
سب نے دیکھا ہے یہی کام تمہارا آگے

خوف سے دیتا ہے سچائی چھپانے کا سبق
میں نہ بھیجوں گا یہ پیغام تمہارا آگے

پھر سے حق گوئی کا الزام کمایا سیّد
نام کچھ کم نہ تھا بدنام تمہارا آگے

غزل

کنارِ دشت ندی آشنائے دشت نہیں
حصولِ قرب ہی وصلت کا بندوبست نہیں

غرور ٹوٹ گیا تو مجھے یقیں آیا
کہ حسن ہو گا محبت انا پرست نہیں

تمام لوگوں کو لگتی ہے اپنی اپنی کیوں !
اگر یہ شاعری میری بھی سرگذشت نہیں

نکلتا جاتا ہے مٹھی سے ریت کی صورت
اگرچہ وقت سمندر ہے جس کا انت نہیں

ہم ارتقا میں بھلا بیٹھے ہیں بقا کا سوال
ہمارے صحن میں بچے تو ہیں درخت نہیں

بندھے ہوئے ہیں طبیعات کے اصولوں سے
ہمارے پاس سلیمان جیسا تخت نہیں

ثنائے معجزہ گر ہے ستائشِ تخلیق
جو نیکیوں کو نہ پرکھے وہ نیک بخت نہیں

تو کیسے ہوتی نہیں کائنات بوسیدہ
جو اس پہ دستِ ہنر کے نشان ثبت نہیں

کئی زمانوں کے کوہ و دمن میں پھرتی ہوئی،
یہ شاعری بھی تو آوازِ بازگشت نہیں؟

یہ کوئی اور ہے دیوار راہِ جنت میں
مزاج میرے خدا کا تو اتنا سخت نہیں

سمے کی ڈور بھی جاذب کہیں تو کٹتی ہے
بندھا جو وقت سے تخلیق کارِ وقت نہیں

اکرم جاذب

غزل

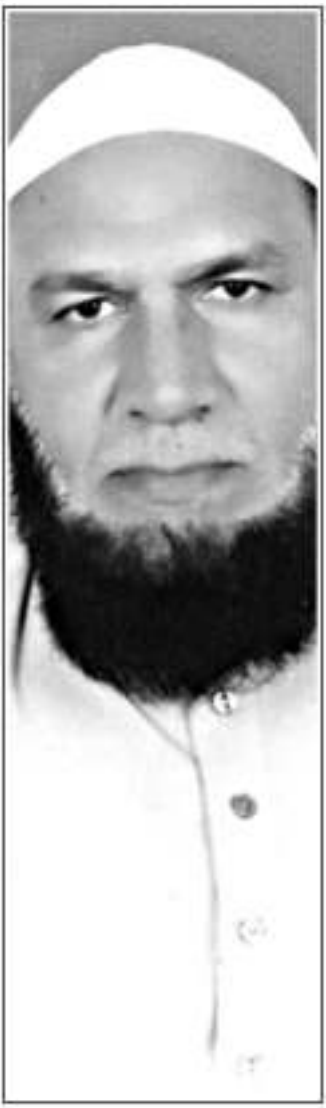

لمحوں کی ملاقات گلے سال کے رکھنا
اچھا نہیں ماتھے پہ شکن ڈال کے رکھنا

نازک ہیں، سبک سہل ہیں جذبات ہمارے
یہ آئینہ خانے ذرا سنبھال کے رکھنا

نظروں میں اگر چہ رہے افلاک کی رفعت
اندیشے مگر ذہن میں پاتال کے رکھنا

درویش کی نظریں ہیں پرے سرحدِ ادراک
آنکھوں میں بظاہر مسلے حال کے رکھنا

شیطاں سے کہیں بڑھ کے ہیں شیطان کے چیلے
بابا جی احتیاط ہی سے بالکے کے رکھنا

سویا ہے میرا یار ابھی نیند سہانی
گردن پہ قدم پھر ذرا بھونچال کے رکھنا

توحید بھی ہو، عشق محمد بھی، اثاثہ
سر قدموں میں اصحاب کے اور آل کے رکھنا

اس شوخ کی یادوں میں رضا زندگی کرنا
یوں درد کو بہلانا کبھی ٹال کے رکھنا

رضا اللہ حیدر

غزل

گو کہ اب تنہا کھڑا ہوں دوستوں کے سامنے
میں اکیلا ہی بہت ہوں دشمنوں کے سامنے

پیڑ کی شاخوں پہ طاری تھی بھیانک خامشی
سانپ جو لپٹے ہوئے تھے گھونسلوں کے سامنے

اور پھر دریا پہ پہرے سخت تر ہوتے گئے
پیاس سے مرتے رہے ہم پانیوں کے سامنے

پا برہنہ، آبلہ پا، پا بجولاں، گام زن
جانے کیسی منزلیں تھیں فاصلوں کے سامنے

جنگ کی روداد ساری چند لفظوں میں کہوں
ایک نہتا آدمی تھا لشکروں کے سامنے

پھر اچانک ایک نادیدہ مدد پہنچی مجھے
ورنہ میں گھبرا رہا تھا مشکلوں کے سامنے

جل رہا ہے تیز آندھی میں بھی مرقد کا چراغ
یعنی میری نیک نامی سازشوں کے سامنے

اپنی گم راہی کا میں الزام دوں تو کس کو دوں
مجھ کو پاسِ بندگی ہے مرشدوں کے سامنے

عین ممکن ہے گرا دوں آخری دیوار بھی
میں کھڑا ہوں آپ اپنے فیصلوں کے سامنے

اب میں سو جاؤں کہ جاگوں، سوچنا ہوگا مجھے
خواب میرے آ گئے ہیں رت جگوں کے سامنے

ایک سایہ تھا مرے سر پر جو ماں کا، اٹھ چکا
کون ڈانٹے گا مجھے اب دوستوں کے سامنے

علمدار حسین

غزلیں

مرے دشمن سے مل کر آ گئی ہے
وہ سمجھانے مجھے گھر آ گئی ہے

پلٹنے کی کوئی صورت نہیں اب
محبت اُس جگہ پر آ گئی ہے

جو سازش ہو رہی تھی پیٹھ پیچھے
مرے آگے وہ یکسر آ گئی ہے

نئی سگریٹ اُٹھا لائے ہو، لیکن
یہ پہلے سے بھی بہتر آ گئی ہے

ہماری زندگی کی فیس ریٹنگ
یونہی تھوڑا سا اُوپر آ گئی ہے

مری مصروفیت کا فون سُن کر
مجھے ملنے وہ دفتر آ گئی ہے

مرے خوابوں کی گاڑی آج شاہد
مجھے بچپن میں لے کر آ گئی ہے

شاہد فرید

خطِ تقدیر نامکمل ہے
میری تعمیر نامکمل ہے

ٹوٹی پھوٹی پڑی ہیں ریکھائیں
یعنی تفسیر نامکمل ہے

حُسن ترتیب دے نہیں پایا
تری تصویر نامکمل ہے

کچھ خیالات بے سر و پا ہیں
کچھ یہ تحریر نامکمل ہے

نارسائی ہے آس پاس کہیں
تیری تسخیر نامکمل ہے

خواب پورا کروں گا میں اپنا
ابھی تعبیر نامکمل ہے

حادثہ سب بیاں کرو شاہد
عذر تاخیر نامکمل ہے

غزلیں

لاکھ روکا جسے جتن کر کے
جا رہا ہے وہ پھر وچن کر کے

گھر کی غربت چھپائے پھرتا ہوں
اُجلے کپڑوں کو زیبِ تن کر کے

سر پہ دنیا اٹھائی ہے اُس نے
چین آئے بھی کیا تھکن کر کے

ہاتھ آیا ہے اک ببول مرے
اُس کو چھوڑوں گا نسترن کر کے

آج برتا ہے قافیے میں تجھے
اور لکھا جنابِ من کر کے

اُس کے طعنوں کے وار سے ارشد
کچھ تو ٹوٹا ہے دل میں چھن کر کے

ارشد محمود ارشد

جلتے دیکھا ہے جب وطن میں نے
دل میں محسوس کی اگن میں نے

میرے گلشن تری حفاظت کو
سر پہ باندھا تو ہے کفن میں نے

جس سے آئے مہک نہ دھرتی کی
اس کو سمجھا ہے کب سخن میں نے

تیری راہوں میں ہیں ببول کھلے
ان کو کرنا ہے نسترن میں نے

سانس کے ٹوٹنے پہ ٹوٹے گی
تجھ سے باندھی ہے جو لگن میں نے

رہنما راہ پر نہیں آتا
یار کیا کیا کیے جتن میں نے

سچ کی صف میں کھڑا تو ہوں ارشد
راستہ چن لیا کٹھن میں نے

غزلیں

کس طرح گزرے گی میری زندگی تیرے بغیر
پھیلتی جاتی ہے دِل میں بے کلی تیرے بغیر

تُو گیا تو کھو گئی ہے شہر میں پہچان بھی
ہو گیا ہے اَجنبی ہر آدمی تیرے بغیر

جاتے جاتے کاش اِتنا ہی بتا جاتے مجھے
میں رکھوں کس سے اُمیدِ دوستی تیرے بغیر

پُھول پژمردہ، اُداسی چار سُو ہے محوِ رقص
غم زدہ، گریہ کناں ہے ہر کلی تیرے بغیر

دِل شکن لہجہ ترا دیکھا تو پچھتایا بہت
میں نے کیوں ٹھکرائی اپنی ہر خُوشی تیرے بغیر

تُو اگر قائل دُکھی ہو بھی گیا تیرا نصیب
اُس پہ بھی طاری رہے گی جاں کنی تیرے بغیر

عمر قیاز قائل

دِل جلانے سے کچھ نہیں ہو گا
اُن کے آنے سے کچھ نہیں ہو گا

غم کے عالم میں دُکھ کے موسم میں
مُسکرانے سے کچھ نہیں ہو گا

جیت بھی دے سکے گی کیا راحت
ہار جانے سے کچھ نہیں ہو گا

بیتی باتوں کا تذکرہ چھوڑو
اس فسانے سے کچھ نہیں ہو گا

جب مراسم نہیں رہے تجھ سے
تیرے جانے سے کچھ نہیں ہو گا

وہ تغافل پسند ہے قائل
دُکھ سُنانے سے کچھ نہیں ہو گا

اُس کا جب میں نہیں رہا قائل
گیت گانے سے کچھ نہیں ہو گا

غزل

خاک سے ہوں، خاک ہوں پھر بھی سراپا نور ہوں
چشمِ فطرت کی نظر ہوں اور خود سے دور ہوں

دیکھیے تو اپنے سائے سے ہے میری کش مکش
سوچیے تو جانشینِ سرمد و منصور ہوں

وادی و پربت میں کس کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں
ہوں کبھی سنگِ ہمالہ، گاہ خاکِ طور ہوں

کون جانے میری ہستی کس عدم کا ہے وجود
ذات میں بے نام ہوں، آفاق میں مشہور ہوں

دہر کی تسخیر کی خاطر ہمہ مختار ہوں
اپنے عرفاں کے سفر میں سر بسر مجبور ہوں

پیچ و خم تقدیر کا، جوہر بنا تدبیر کا
دستِ قدرت میں کبھی قادر کبھی مقدور ہوں

میرے اپنے سانس بھی ٹھکرا رہے ہوں جب مجھے
اُس سے بھی اک صدائے غیب کو منظور ہوں

روح و مادہ کا گریزاں وصلِ باہم، الاماں!
ساقیء ہشیار ہوں، پیمانہء مخمور ہوں

دعویٔ ہستی میں مجھ ناچیز کو رکھیے معاف
اس حوالے سے خدا شاہد ہے میں معذور ہوں

رد کرو فیضان یا مقبول، مرضی آپ کی
کر رہا ہوں بس وہی جس کام پر مامور ہوں

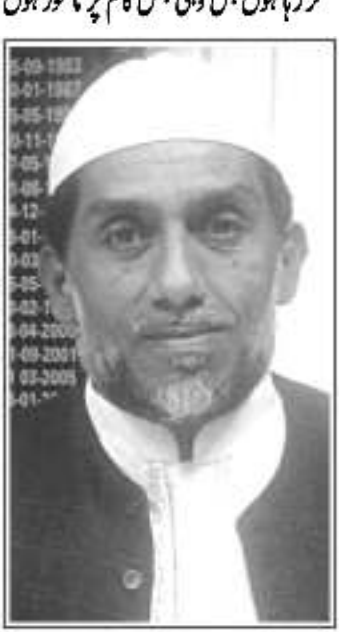

فیض رسول فیضان

غزل

خزاں رسیدہ سہی پھر بھی چھاؤں جیسا ہے
ہمارے گاؤں کا ہر پیڑ ماؤں جیسا ہے

چراغ جب سے جلایا گیا اندھیروں میں
ہر ایک شخص کا لہجہ ہواؤں جیسا ہے

ڈبو دے اس کو بھی فرعون کی طرح مولا
یہاں کا صاحبِ مسند خداؤں جیسا ہے

ہرے نہ پیڑ ہوئے ہیں، نہ پھول نکلے ہیں
ہمارے دیس کا موسم خزاؤں جیسا ہے

ہماری سوچ میں سرسوں کے پھول کھلتے ہیں
ہمارے ذہن کا موسم بھی گاؤں جیسا ہے

وطن میں دیکھو تو ان کے مزاج شاہی ہیں
رویہ جن کا جہاں میں خداؤں جیسا ہے

اُمیدِ بخششِ پروردگار ہے ہم کو
ہر ایک فعل اگرچہ خطاؤں جیسا ہے

ہم اہلِ بیت کے شیدائی ہیں کہ جنکا عقیل
ہر ایک سانس خُدا کی رضاؤں جیسا ہے

عقیل رحمانی

غزلیں

بات کو دل میں اتارا کیجیے
اور نفرت سے کنارہ کیجیے

خوبصورت اس طرح لگتی ہیں آپ
بال بس یونہی سنوارا کیجیے

کتنا دلکش اورحسیں منظر ہے یہ
آپ چُپ رہ کر نظارہ کیجیے

پاس رکھ لو اپنی ساری یہ خوشی
اپنے صدموں کو ہمارا کیجیے

جانتے ہیں کہ یہ مشکل ہے مگر
آپ اپنے طور چارہ کیجیے

وہ نہیں آتے نہ بے شک آئیں پر
آپ بس ان کو پکارا کیجیے

شرط ہے یہ ساتھ چلنے کی کلیم
کام بس یہ ہی خدارا کیجیے

محمد کلیم

اب کہاں میرا ، آنا جانا ہے
میرا گھر ہی ، مرا ٹھکانا ہے

تیر پھینکا تو دو قدم تھا شکار
کیا شکاری ہے کیا نشانہ ہے

کوئی پہچانتا نہیں ، اَب بھی
روز اُس گھر میں آنا جانا ہے

میں زمانے کے ساتھ چل نہ سکا
پیچھے پیچھے ، مرے ، زمانہ ہے

اُس سے بے نام سا تعلق ہے
اَب یہی زیست کا بہانہ ہے

حاصل زیست کچھ نہیں اعجاز
بس یونہی عُمر کا گنوانا ہے

اجمل اعجاز

غزل

بات جب تک کہی نہیں جاتی
دل سے آزردگی نہیں جاتی

بات کو جس قدر چھپا لیں ہم
بات ناگفتنی نہیں جاتی

عُمر جاتی رہی مگر اب تک
دل کی آشفتگی نہیں جاتی

اتنے غم دے دیے مگر پھر بھی
تیری دریا دلی نہیں جاتی

اتنا کچھ پا کے بھی نہ جانے کیوں
زندگی سے کمی نہیں جاتی

اتنے دھوکے بھی کھا کے اس دل کی
ہائے سادہ دلی نہیں جاتی

داغ پر داغ لگ گئے اس پر
دل کی پر دل لگی نہیں جاتی

بات بے بات معذرت پر بھی
آپ کی برہمی نہیں جاتی

راجہ عبدالقیوم

غزلیں

بنگلہ، کار نہ زر چاہوں میں
تیرے دل میں گھر چاہوں میں

شوق شہادت کا ہے مجھ کو
اور سلامت سر چاہوں میں

دن بھر محنت اور مشقت
رات کو اک بستر چاہوں میں

ہر سو پھولوں پر ہو تتلی
ایسا اک منظر چاہوں میں

حوصلہ دیکھ مرا تُو افضل
شیشہ ہوں پتھر چاہوں میں

افضل ہزاروی

مجھ کو اتنے بھائے پتھر
میں نے گلے لگائے پتھر

خوابوں میں تو گل ہی گل تھے
تعبیروں میں پائے پتھر

تجھ پر پھولوں کی برساتیں
میری جانب آئے پتھر

حیرت ہے اس بات کی مجھ پر
پھولوں نے برسائے پتھر

کیا میں رسم و راہ بڑھاتا
تھے میرے ہمسائے پتھر

دھیرے دھیرے موم ہوئے ہیں
آخر کو مسکائے پتھر

لہو لہو جب جسم ہوا تو
پھر ہی سمجھ میں آئے پتھر

اُف بھی نہیں کی میں نے افضل
خاموشی سے کھائے پتھر

غزل

جنہیں شب کی حمائت میں گلہ تھا یہ، ہوا کم ہے
سحر سے پوچھتے کیوں ہیں کہ میرا اک دیا کم ہے

ذرا سی ٹیس لگتی ہے تو اک دم ٹوٹ جاتا ہوں
مری مٹی میں کوزہ گر لچکنے کی ادا کم ہے

ابھی کچھ دیر رہنے دے بدن پاؤں کی ٹھوکر میں
ترے لہجے میں اب بھی انکساری کی ادا کم ہے

مری مٹی کی تابانی پہ تارے طنز کیا کرتے
کہ میری ابتدا سے اب بھی انکی انتہا کم ہے

نظر سرشار تھی لیکن بدن کی پیاس ویسے تھی
اسے دیکھا بہت ہم نے مگر اس کو چھوا کم ہے

تو پھر بہتر یہی ہے راستے اپنے جدا کر لیں
تجھے بھی خوف رسوائی مجھے بھی حوصلہ کم ہے

کوئی تازہ ستم بہر کرم، ہم کو عنائت ہو
ہمارے حوصلے کو ہجر کا اک سانحہ کم ہے

محمد نور آسی

غزل

مرے کھیتوں میں نم باقی نہیں ہے
کہ جب سے تیرا غم باقی نہیں ہے

تری درماندگی باقی ہے لیکن
ترا جاہ و حشم باقی نہیں ہے

میسر ہے ترے آنے سے سب کچھ
حسابِ بیش و کم باقی نہیں ہے

ہمارا خالی پن یہ کہہ رہا ہے
کوئی اہلِ قلم باقی نہیں ہے

حصارِ گمرہی میں گھِر گیا ہوں
ترا لطف و کرم باقی نہیں ہے

عبث ہے شکوۂ جبرِ زمانہ
ترے ہاتھوں میں دم باقی نہیں ہے

ابھی تک نیم جاں زندہ ہے اصغر
کوئی رسمِ ستم باقی نہیں ہے ؟

اصغر علی بلوچ

غزل

وہ لوگ جن کے نام کے جلتے چراغ تھے
نسبت ہے اپنی ان سے جو عالی دماغ تھے

ہم وہ ہیں زد میں آئے جو توسیع شہر کی
ہم وہ ہیں جن کے گاؤں میں آموں کے باغ تھے

ہم سے ہی باز پرس ہوئی جا رہی ہے دیکھ
ہم نے ہی باغیوں کے لگائے سراغ تھے

ساقی خیال رکھنا وہ اپنا تھا مے کدہ
اپنی صراحیاں تھیں اور اپنے ایاغ تھے

توبہ نے صاف کر دیا ہے فرد جرم کو
سب دھل گئے ہیں جتنے بھی دھبے تھے داغ تھے

اولے پڑے تو سب کے سب مرجھا کے رہ گئے
ہریالی شاخ شاخ تھی دل باغ باغ تھے

اکرم ناصر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بن کر سپردگی کا تصور پگھل کے آ
مجھ تک تو اپنے جسم کے شعلوں پہ چل کے آ

غزل

یہ کاروبارِ زمانہ تمام ہوتے ہی
مکان بولنے لگتے ہیں شام ہوتے ہی

مری غزل کے سب الفاظ مسکراتے ہیں
کسی کی یاد سے محوِ کلام ہوتے ہی

جو چل رہے ہیں قدم سے قدم ملائے ہوئے
نظر نہ آئیں گے وہ اپنا کام ہوتے ہی

اِسی لئے تو مَیں گمنام رہنا چاہتا ہوں
زمیں پہ رہتے نہیں لوگ نام ہوتے ہی

چمک اُٹھا ہے مقدر، وہ حاضری ہوئی ہے
میں بادشاہ ہوا ہوں غلام ہوتے ہی

قیام کرنا ہے کچھ دیر اِس سرائے میں
کہوں گا شکریہ! مَیں انتظام ہوتے ہی

ہَوائیں سَر کو پٹکتی ہیں بین کرتے ہوئے
ظہور شام کی گلیوں میں شام ہوتے ہی

ظہور چوہان

غزل

مہینوں سے جو خوابوں کا بھیانک سلسلہ ہے
یہ میرے ساتھ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے

سبھی خوشیاں میسر ہیں مگر جانِ تمنا
تمہاری رخصتی سے جو خلا تھا، وہ خلا ہے

ضروری ہے ٹھکانہ چاند کے اس پار کوئی
زمیں پر ڈھیر اب بارود کا پھٹنے چلا ہے

ہمارے قتل نامے پر تمہارے دستخط ہیں
یقینی، بے یقینی کا عجب اک مرحلہ ہے

مجھے جھنجھوڑ کر کہنا پڑا اک روز خود سے
یہ کس جنجال میں، کس کوفت میں تو مبتلا ہے

فقط اپنے ہی دکھڑے تو اسے لاحق نہیں تھے
کچھ اپنی کچھ پرائی آگ میں بھی دل، جلا ہے

کبھی بھولے سے اک جھونکا نہیں آیا ادھر کو
ہمیں صبحِ بہاراں سے گلہ ہے برملا ہے

کتابوں میں پڑھا تھا ایک ہیں دکھ سکھ ہمارے
مگر عملاً نہیں ایسا، یہ نعرہ کھوکھلا ہے

نہ ہونے کا ہے جو احساس دامن گیر احمد
یہ میری مجھ میں ہے آمد کہ میرا انخلا ہے

احمد محسود

غزل

مشکل سے ہی آسانی کی صورت نظر آجائے گی
چادر یہ شب کی چیر کے روشن سحر آجائے گی

یونانیوں عربوں سے انگلستان امریکہ گئی
لازم یہاں بھی روشنی کر کے سفر آجائے گی

مانا ابھی تو مارنے مرنے سے فرصت ہی نہیں
اک دن ہمیں بھی زندگی کرنی بسر آجائے گی

مانا کہ اب تک یہ وطن گزرا ہے نازک موڑ سے
پر اک نہ اک دن سامنے پکی ڈگر آجائے گی

مایوس مت ہونا اسی امید پہ پڑھتے رہو
چھپ کر کبھی اخبار میں سچی خبر آجائے گی

اے قوم دنیا میں کہاں اب دشمنی کا دور ہے
کرنی تجھے بھی دوستی کوشش تو کر آجائے گی

موسم غموں کا بھی گزر جائے گا عاجز غم نہ کر
خوشیوں کی رت بھی دربدر ہو کر ادھر آجائے گی

الف عاجز

غزل

یہی نہیں بیان تک نہیں رہا
مجھے تمھارا دھیان تک نہیں رہا

جہاں پر ایک شہرِ خوش نگار تھا
وہاں پر اک مکان تک نہیں رہا

کسی کی آنکھ میں بھی اس کا عکس ہے
ستارہ آسمان تک نہیں رہا

کمان میں جو تیر ہے خراب ہے
جو تیر تھا کمان تک نہیں رہا

سبھی کو اک نئے جہاں کی فکر ہے
کوئی بھی اس جہان تک نہیں رہا

میں وہ سوال ہوں کسی کے باب میں
جو یاد امتحان تک نہیں رہا

امتیاز انجم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جسم کے پار کون دیکھے گا
روح کا بار کون دیکھے گا!

غزلیں

بے سبب قہقہہ اچھالا ہے
یہ اداسی کا حل نکالا ہے

بھوک دونوں کو مار ڈالے گی
درمیاں آخری نوالا ہے

مجھ کو وحشت پڑھائی جاتی تھی
میں نے استاد مار ڈالا ہے

میں اسے یوں سنبھالے پھرتا ہوں
وہ ہتھیلی کا جیسے چھالا ہے

ہاتھ میں ہاتھ ہے اگر تیرا
یہ اندھیرا بھی پھر اجالا ہے

سب گناہوں پہ فخر کرتے ہیں
آج کا دور بھی نرالا ہے

رتجگے آنکھ سے نچوڑے ہیں
درد سے درد کو سنبھالا ہے

نسل در نسل ہم حسینی ہیں
صبر کا دشت دیکھا بھالا ہے

حد بناتا ہے قید خانہ نہیں
عشق مکڑی کا ایک جالا ہے

خالد ندیم شانی

میں لپٹ کے خود سے ہوں کہہ رہا میں اداس ہوں
کسی اور سے تو نہیں کہا میں اداس ہوں

وہ جو دھڑکنوں کے مزاج تک سے تھا آشنا
اسے کیوں نظر نہیں آ رہا میں اداس ہوں

میں اداس ہوں میں اداس ہوں میری بات سن
اسے صرف جا کے یہی بتا میں اداس ہوں

وہ جو ایک دم سے بچھڑ گیا تو میں شل ہوا
مجھے دوسروں سے پتا چلا میں اداس ہوں

میرے اپنے بخت کی بات ہے میں اجڑ گیا
وہ کسی کا کیوں نہیں ہو سکا میں اداس ہوں

مرے بارشوں سے مچلتے دل کا بھی مان رکھ
سبھی کام چھوڑ کے جلدی آ میں اداس ہوں

تجھے لگ رہا ہے کہیں سے بھی مجھے رنج ہے؟
تجھے کس طرح سے پتا چلا میں اداس ہوں

میں تڑپ رہا ہوں فراق میں تری یاد میں
مجھے اپنے سینے سے پھر لگا میں اداس ہوں

وہی رنگ ہو وہی ڈھنگ ہو مرے دیوتا
اسی نام سے مجھے پھر بلا میں اداس ہوں

تری بے رخی کا کمال ہے یہ ملال سب
کوئی وصل رت کا بھی گیت گا میں اداس ہوں

کوئی پوربا نگ کا راگ ہو، کوئی ناگ ہو
مجھے شدھ بہار تو مت سنا میں اداس ہوں

غزلیں

تیری خوشبو کی بھی تصویر بنا سکتے ہیں
چاند تارے ترے دیدار کو آ سکتے ہیں
دیکھیے ضد نہ کریں ہجر مجھے رکھنا ہے!
آپ یہ گوہر نایاب گنوا سکتے ہیں!!!!
چودھویں رات ہے، تارے بھی زمیں پر ہوں گے
آپ اگر چاہیں تو ہم خواب سجا سکتے ہیں!!!!!
جن کی سانسیں تری انگلی کا اشارہ سمجھیں
کیسے ممکن وہ تجھے چھوڑ کے جا سکتے ہیں
جن کی آنکھوں نے چمکتی تری آنکھیں دیکھیں
پھول صحرا میں کسی روز اگا سکتے ہیں
منتظر چاند کی خاطر کو گھڑی پل کے لیے
ضد لیں چہرے سے زلفوں کو ہٹا سکتے ہیں؟
باوضو اس لیے رکھتا ہوں میں آنکھیں اپنی
آپ سرکار مرے خواب میں آ سکتے ہیں
آپ بس حکم کریں دیکھتے جائیں دانش
ہم سمندر کو بھی صحرا میں بلا سکتے ہیں

دانش عزیز

حد سے بڑھ جائیں تو لہجے تلک آ سکتے ہیں
غم زیادہ ہوں تو یہ راس بھی آ سکتے ہیں
ہجر کا شعلہ ہتھیلی پہ اٹھائے ہوئے لوگ
ایک ہی پھونک سے سورج کو جلا سکتے ہیں
خشک پپڑی زدہ شاخیں بھی دعائیں دیں گی
ہم درختوں کی اگر پیاس بجھا سکتے ہیں
چاک اپنا ہے یہ مٹی بھی ہے تازہ اب تک
جیسے ہم چاہیں خد و خال بنا سکتے ہے
آپ کہتے ہیں تو ہٹ جاتا ہوں منظر سے مگر
آسماں میں نے اٹھایا ہے، اٹھا سکتے ہیں؟
در و دیوار مرے حکم سے چپ ہیں ورنہ
صبر ڈھل جائے اگر، شور مچا سکتے ہیں
ان فقیروں کی فقیری پہ عطا ہے رب کی
وقت جب چاہیں یہ الٹا بھی گھما سکتے ہیں
جا بجا جن کی جبینوں کے نشاں ہیں ظاہر
وہ مرے سر کو بھلا خاک جھکا سکتے ہیں
خاک اڑانے کا ہنر سیکھ چکا ہوں پہلے
آپ اس خاک سے کچھ اور بنا سکتے ہیں؟
یہ کبوتر کسی گنبد کے مجاور ٹھہرے
ان کا چھوڑا ہوا ہم شوق سے کھا سکتے ہیں
بوڑھے پیڑوں کو خدا نے یہ ہنر بخشا ہے
کٹ بھی جائیں تو تعلق کو نبھا سکتے ہیں
ہم نے پلکوں سے تمہیں باندھی ہے دنیا دانش
جس گھڑی چاہیں اسے پاؤں میں لا سکتے ہیں

غزل

سنبھل سنبھل کے وہ طے گام گام کر رہا ہے
سجھ سجھ کے ، تعلق پہ کام کر رہا ہے

دیے جلاتا ہوا ، گھنٹیاں بجاتا ہوا
بڑے ہی چاؤ سے اک بت کو رام کر رہا ہے

یہ آسمان ، یہ بے انتہا اداسی دیکھ
ستارہ وار یہاں غم خرام کر رہا ہے

یہ وقت باغ مہکنے کا ہے ، جگاؤ اُسے
جو شخص خواب سرا میں قیام کر رہا ہے

سپردِ غیر نہ کر دوں میں اسکے دن جو یہاں
کسی کے ساتھ بسر میری شام کر رہا ہے

محبتوں میں یہ ہٹ دھرمیاں نہیں چلتیں
انا کا ہو کے وہ قصہ تمام کر رہا ہے

پھر اس نے اپنی ضرورت بھی پیش کر ڈالی
شروع میں تو لگا ، احترام کر رہا ہے

صائمہ آفتاب

غزلیں

جب بچھڑنے کا ہی ارادہ ہو
کیا؟ ضروری ہے پہلے جھگڑا ہو
کاش پورا ہمارا سپنا ہو
سچی باتوں کا خوب چرچا ہو
آج پھر خوبرو نے آنا ہے
آج ممکن ہے پھر تماشا ہو
وہ محبت کے گیت گاتا ہے
پیار کا درد جس نے جھیلا ہو
رات بھر نیند پھر نہیں آتی
جب جدائی کا دل میں خدشہ ہو

عابد معروف مغل

ایسے دشمن سے لڑنا ہمت ہے
جس کی ہر بات میں سیاست ہے
جب خبر ہے وہ سچ نہ مانے گا
بات کرنے کی کیا ضرورت ہے
وقت ساکت ہے دیکھ حیرت سے
اپنی بستی میں کیوں جہالت ہے
کتنے نایاب ہیں اثاثے یہ
میرا ہر شعر میری دولت ہے
جس نے منصف خرید رکھے ہیں
اُس کی مرضی کی ہر عدالت ہے
ہر طرف قحط کا سماں ہے اب
حاکمِ وقت کی حماقت ہے

کیا ضروری ہے یہ سیاست میں
باپ کا جانشین بیٹا ہو
مجھ سا پگلا کہاں ملے گا تمھیں
منصفِ شہر پر جو ہنستا ہو
یاد آتے ہی درد بھولوں میں
کوئی ایسا حسین سپنا ہو
سب نے عابد یہ سوچ رکھا ہے
بس مرے نام کا ہی چرچا ہو

اور کچھ بھی نہیں طلب اپنی
ایک روٹی کی بس ضرورت ہے
آج کچھ کام کر نہ پاؤں گا
آج ناساز کچھ طبعیت ہے
شعر اس کے کمال ہیں سارے
اس کے لہجے میں ایسی جدت ہے
صاف قرآن میں لکھا ہے یہ
اس کا ہر ایک لفظ حکمت ہے
ایسے رہبر کو ڈھونڈنا ہے ہمیں
جس کو اس دیس سے محبت ہے

غزل

وہی ہے آنکھ کے آنگن سے دل کے بام تلک
اگرچہ بھول گیا ہوں میں اس کا نام تلک

بہت سے سال پڑے ہیں مسافتوں کے ابھی
مرے مقام سے لے کر ترے مقام تلک

گزرتی عمر کا کیا ہے ، گزر ہی جائے گی
کسی کی صبح تلک ہے کسی کی شام تلک

اے ساقیا! تری رخصت پہ چپ ہے میخانہ
ترے فراق میں روئے چھلکتے جام تلک

نجانے قید میں گزریں گے اگلے دن کس کے
ہزاروں پنچھی چلے ہیں حصارِ دام تلک

خلش رہے گی پسِ مرگ بھی ، یہ شمس مجھے
وہ مجھ سے روٹھا رہا آخری کلام تلک

آفتاب محمود شمس

غزل

کل اس کا دور سے ہی نظارا ہوا نصیب
خواہش تو چاند کی تھی ستارا ہوا نصیب

تھاما جو اس نے ہاتھ تو ایسا لگا مجھے
جیسا کے ڈوبتے کو کنارا ہوا نصیب

تو اپنی آرزو میرے قدموں میں ڈال دے
دیکھے کبھی جو تو میرا ہارا ہوا نصیب

جانے کیوں انکو اپنے مقدر پہ ناز ہے
وہ لوگ جن کو ساتھ ہمارا ہوا نصیب

اپنے ہر ایک خط پہ وہ لکھتا ہے آرزو
خوش ہوں کہ مجھ کو پیار تمہارا ہوا نصیب

خالق آرزو

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہم تو کویتا پڑھ پڑھ روئے
اور کوی نے محل اسارا

غزلیں

پیار اپنا آزما کر دیکھ لو
اپنا غم اس کو بتا کر دیکھ لو

چار جانب ہیں اندھیرے درد کے
مَن نگر کو جگمگا کر دیکھ لو

آج تک وہ گھر نہیں آیا تو کیا
اِک دفعہ اس کو بُلا کر دیکھ لو

خود چلا آئے گا پروانہ یہاں
پیار کی شمع جلا کے دیکھ لو

جو کھڑی دیوارِ غم ہے درمیاں
کرکے جرأت وہ گرا کے دیکھ لو

جو لکھے اس کے لیے تم نے سدا
وہ ہی نغمے گُنگنا کے دیکھ لو

فہمیدہ مقبول

کچھ اور درد پال لیا دے کے ہم نے دِل
کیسا نیا وبال لیا دے کے ہم نے دل

جس دم دکھوں کی دھول سے چہرہ بھی اَٹ گیا
اشکوں سے منہ کھنگال لیا ہم نے دے کے دل

رہتے ہیں دِل فگار سے ہر وقت ہر گھڑی
رنج و اَلم کا جال لیا دے ہم نے دل

ہونے دیا عیاں نہ کسی پر بھی اپنا غم
خود کو دُکھوں میں ڈھال لیا دے کے ہم نے دِل

لائیں کہاں سے ڈھونڈ کے اس دِل کی راحتیں
فہمیدہ روگ پال لیا دے کے ہم نے دِل

غزل

میں سوچتی ہوں پسِ آسمان ہے ہی نہیں
فلک کے پاس زمیں کی لگان ہے ہی نہیں

بڑے ہی شوق سے رہتی ہوں زیرِ سایہِ جسم
زمیں پہ میرے لیے اب مکان ہے ہی نہیں

کہیں بھی جائیں، ہمیں قتل ہی تو ہونا ہے
جہاں میں کوئی بھی جائے امان ہے ہی نہیں

اڑے گا کس طرح افلاک کی بلندی پر
تمہاری سوچ کے پنچھی میں جان ہے ہی نہیں

میں کس طرح سے سمن گیت گاؤں شاہوں کے
جب ایسے لوگوں کی کوئی بھی شان ہے ہی نہیں

رخسانہ سمن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تائب کے حفیظ، ندیم کے مان، گوہر پہ نگاہ نجیب سمان
ہم لوگ پسِ دیوارِ کرم اے انجمن آرا بیٹھ رہے

غزل

جنھیں ہو مانگنا ہم سے حسابِ در بدری
وہ پہلے جھیل کے آئیں عذابِ در بدری

یہ افتخار ہے ہجرت گزیدہ لوگوں کا
ہر ایک کو نہیں زیبا خطابِ در بدری

ہمارے حصے میں لکھے گئے تھے روزِ ازل
خمارِ فقر و غنا اور شرابِ در بدری

ہمارے پاؤں کے نیچے رواں ہے ریگِ سفر
ہمارے سر پہ دواں ہے سحابِ در بدری

یہ دشت داری، نہیں ہے تمھارا کام، تمھیں
شعورِ خانہ بدوشی ، نہ تابِ در بدری

ہم ایسے عامی و گم نام بھی نوازے گئے
بہ فیضِ مہتر و عزت مآبِ در بدری

ہمی تھے حلقۂ آوارگاں کے پیش امام
ملی ہے تختے میں ہم کو کتابِ در بدری

اک التجائے تلطف ، بہ پیشِ مرشدِ قیس
اک التماسِ دعا ، در جنابِ در بدری

رانا غلام محی الدین

غزل

صحرا میں کچھ سکون کہیں پائے غم ترا
آنکھوں کی پتلیوں پہ نہ یوں آئے غم ترا

کچھ دیر کے لیے غمِ دنیا تمام شد
کچھ دیر کے لیے جو مل پائے غم ترا

خوشبو کے پیرہن کی اداسی کا منتظر
مجھ تک پہنچنے دلا ہے گلہائے غم ترا

اے کاش کوئی ساز ہو دل کے قریب کا
او اک دل جلا بھی کہ جو گائے غم ترا

آسیب کی طرح ہے جو قبضہ کیے ہوئے
گھن کی طرح وجود نہیں کھائے غم ترا

اپنی تمام خوشیوں کو خیرات کر دیا
آیا تھا ہاتھ اپنا جو پھیلائے غم ترا

خود سے بھی دور کرتا ہے اکثر مجھے مگر
پر، مجھکو تیرے پاس بھی لے جائے غم ترا

ملیحہ سیّد

غزل

شام کی بالکونی میں آہوں کا دیپک سُلگتا رہا
شاہ زادی کی دُھن میں کوئی شاہزادہ بھٹکتا رہا

شام کے ناتواں زرد رُو گال پر ہاتھ رکھّے ہوے
خواہشوں کی چنگیری میں، جی نان حسرت کے رکھتا رہا

اُس کی تصویر سے چُپ کی بولی میں باتیں میں کرتا رہا
اور بے اِختیاری کے پہلُو میں دل آہ اُچھلتا رہا

دن کی چادر کو ہولے سے شب کے بدن پر کیے زیبِ تن
ساحلِ دور د پر ننگے پاوں بہت چاند چلتا رہا

موجِ غم جسم و جاں کو بہا کر بہت دور تک لے گئی
قطرہ قطرہ لہو آنکھوں کے روزنوں سے ٹپکتا رہا

میں کہ اک رزمیہ داستاں کا بہت ناتواں فرد تھا
دیو کی مٹھی سے خواب میں اک پری کو چھُڑاتا رہا

اُس غزال آفریں کی نظر جو پڑی تو غضب یہ ہُوا
عارضِ جاں بلب کا گھڑی دو گھڑی سانس چلتا رہا

سرفراز عارض

غزل

کوئی اپنا اور پیارا دور ہے، اس نے کہا
دل بھی اس کی یاد میں مجبور ہے، اس نے کہا

گلستاں یہ کس قدر مسرور ہے، میں نے کہا
خار و گل، غنچہ کلی رنجور ہے، اس نے کہا

مُدتوں سے اس وطن، پیارے وطن کے صحن میں
رات ہے اور رات بھی بے نور ہے اس نے کہا

آپ کی زلفیں تو جیسے رات کی تاریکیاں
آپ کی آنکھیں بہت مخمور ہیں، اس نے کہا

ہر طرف ظلم و ستم ہے، ہر طرف جور و جفا
یہ سماں کس کو بھلا منظور ہے، اس نے کہا

میں نے پوچھا "باغباں! پھولوں پہ کیوں تیرا ستم؟"
یہ مرا آئین ہے، دستور ہے، اس نے کہا

نالہ و ماتم کی آوازیں جیا ہر سمت ہیں
اشک و گریہ سے وطن معمور ہے اس نے کہا

جیا قریشی

غزل

کوکی گل

وہی جیتے گا گھبرو ساگروں پر
نشانہ باندھ لے جو گاگروں پر

مسافت کے وہ چھالے یاد آئیں
نظر پڑتی ہے جب بھی جھانجروں پر

نہیں قابل رہے جو منصبوں کے
رہی دستار ان کے ہی سروں پر

کہ جن کی شاعری نے بھید کھولے
لگیں پابندیاں ان شاعروں پر

وہ کیوں نا چھو کے آئیں آسماں کو
بھروسہ ہے جنہیں اپنے پروں پر

نہیں سر پر ردائیں مفلسی کے
بچھی ہیں چادریں گل! مقبروں پر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد افقِ خاک رہا ، رنگ میں غلطاں
مجھ تک کبھی لے کر تری باس آئی نہ دنیا

غزل

منزلِ نو نظر میں رہتی ہے
زندگانی سفر میں رہتی ہے

کوچ جس دن سے کر گیا ہے تو
بے قراری سی گھر میں رہتی ہے

یہ سنا کرتا تھا مَیں بچپن میں
ایک بڑھیا قمر میں رہتی ہے

خوف کھاتا ہے جو تلاطم سے
ناؤ اس کی بھنور میں رہتی ہے

فن پہ چاہے عبور ہو حاصل
ایک خامی ہنر میں رہتی ہے

بخت کی تیرگی خیالی اب
جستجوئے سحر میں رہتی ہے

زبیر خیالی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دیکھنا یہ ہے کہ ہم کیوں سرِ کہسار آئے
قد بڑھانے اگر آئے ہیں تو بے کار آئے

غزلیں

میں کسی صبحِ ابد تاب کی حسرت لے کر
چلتی رہتی ہوں یہ گلہائے محبت لے کر

شہرِ بے حس میں اگر رسمِ مروت نہ رہی
میں کہاں جاؤں گی احساس کی دولت لے کر

زندگی سے نہیں بنتا کوئی شکوہ میرا
میں جو لائی تھی چلی ہوں وہی حسرت لے کر

مرنے والے نے جہاں بھر کو یہ پیغام دیا
کوئی جینا نہیں احساسِ ندامت لے کر

اس رفاقت کی نزاکت کو جہاں جانتا ہے
پھول کھلتا ہے چمن زار میں نکہت لے کر

فرق رکھا ہی نہیں میں نے محبت میں روا
کیا کروں گی میں بھلا آپ سے سبقت لے کر

عنبرین خان

طلب کا پیرہن چاہا، تمنا کا تگیں مانگا
دمِ آغاز جو بھولا وہ وقتِ واپسیں مانگا

میں اپنی آپ زندانی کسی سے کیا گلہ کرتی
اسی سے فاصلے رکھے جسے دل کے قریں مانگا

بہت ہی قیمتی دل تھا مگر میں کشمکش میں تھی
کبھی رکھا کبھی تھاما، کہیں چھوڑا کہیں مانگا

ارے لفظوں کے سوداگر یہ کیسی الجھنیں دے دیں
رفاقت کی سند مانگی محبت کا یقیں مانگا

مکمل مل نہیں سکتا، ادھورا میں نہیں لوں گی
اُسے یوں عنبرین اُس سے، اِسی ضد میں نہیں مانگا

غزل

آ اِدھر، ہاتھ بڑھا! رقص میں شامل ہو جا
اپنا دامن نہ بچا رقص میں شامل ہو جا

یار روٹھا ہے اگر تجھ سے تو پھر ڈال دھمال
مست ہو، ڈھول بجا، رقص میں شامل ہو جا

یہ زمیں، چاند، ستارے یہ فلک ناچے گا
ان کو انگلی پہ نچا رقص میں شامل ہو جا

جھوم کر اس نے کہا: یار نہیں پردہ نشیں
آنکھ سے پردہ ہٹا! رقص میں شامل ہو جا

جھانک کر دیکھ ذرا دیدۂ بیدار کے ساتھ
تجھ میں بستا ہے خدا رقص میں شامل ہو جا

یار نے تجھ کو بلایا ہے تو پھر دیر نہ کر
ناچ! اور ناچتا جا رقص میں شامل ہو جا

روند پاؤں تلے شہباز زمیں مستی میں
آسماں سر پہ اٹھا رقص میں شامل ہو جا

شہباز سرور

غزل

جب تلک وہ ساتھ تھا اِک گنگناتی دھوپ تھی
ہر طرف ہی سردیوں کی مسکراتی دھوپ تھی

خواب میں آیا تھا کوئی روشنی پہنے ہوئے
اور چہرے پر سنہری جھلملاتی دھوپ تھی

کھل اٹھے تھے زخم سارے سرخ پھولوں کی طرح
وہ تمہاری یاد تھی یا معجزاتی دھوپ تھی

چل دیا تھا میں اکیلا خود سے ملنے کے لیے
دور تک بنجر زمیں تھی چلچلاتی دھوپ تھی

شام کی پرچھائیوں میں راز یہ مجھ پر کھلا
اس زمیں پر ہر طرف سائے بناتی دھوپ تھی

آسماں سے جیسے اتریں تتلیوں کے قافلے
بادلوں کی اوٹ سے یوں چھن کے آتی دھوپ تھی

اب تو آصف کہر نے ڈیرے جمائے ہیں مگر
ہر طرف اس کی ہنسی کی چہچہاتی دھوپ تھی

یاسر رضا آصف

غزل

کرکے دیوار محبت کا بھرم رکھوں گی
میں عزادار محبت کا بھرم رکھوں گی

گھول کر نقشہ اذیت کے بھرے ساغر میں
اپنی سرکار محبت کا بھرم رکھوں گی

آج سقراط کی یادوں کا بھرم رکھتے ہوئے
آج سرشار محبت کا بھرم رکھوں گی

پاؤں باندھے ہوئے میں رقص کروں گی اور پھر
موج میں یار محبت کا بھرم رکھوں گی

تلخ جملوں سے مرے دل کا محل ٹوٹ گیا
کارِ بیکار محبت کا بھرم رکھوں گی

سمیرا یوسف

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دنیا فقط گماں ہے، سب کچھ درونِ جاں ہے
جاگو ضرور خالد، آنکھیں مگر نہ کھولو

غزل

رنگوں سے مزین ہے قلم دان ہمارا
ہے رنگِ سُخن اور مری جان ہمارا

جب تک تری تصویر کشی کی نہیں ہم نے
بے معنی و بے رنگ تھا دیوان ہمارا

یہ راز ہی رہنے دے، یہی ٹھیک رہے گا
کیوں قصرِ جُنوں رہتا ہے سنسان ہمارا

اترے تھے کسی دشت میں ہم روزِ ازل کو
صحرا کی طرف جتنا ہے میلان ہمارا

برسوں سے ہیں محروم تری نظرِ کرم سے
سو حد سے زیادہ ہُوا نقصان ہمارا

ہر صبح ترا عکس دکھا دیتا ہے کوئی
اس واسطے آباد ہے زندان ہمارا

آباد ہوئی دھرتی دلِ وحشی کی جامی
جس کو بھی ملا حلقۂ عرفان ہمارا

مستحسن جامی

غزل

دھیان بھٹکا ہی نہیں اُس کی گھنی باتوں سے
ورنہ ہو جاتا سبک سیر میں انگاروں سے

اُس نے پیراہنِ خوش رنگ چُنا تیرے لیے
اور ہونٹوں کا لیا رنگ الگ پھولوں سے

میں تو خاموشی سے برباد ہوا جاتا تھا
اُس نے پہچان کرائی مری تمثالوں سے

وصل آرائشِ اندوہ سے بیدار ہوا
ہجر کے سانپ نے جب مجھ کو ڈسا چالوں سے

دشت کی لمبی مسافت مجھے راس آ ہی گئی
خوف آنے لگا اک دن مجھے سناٹوں سے

میں جو شوریدہ تھا اور پھر ہمہ تن گوش ہوا
یہ ہنر بھی مجھے آیا ترے اندازوں سے

پھول نے بات نہ کی آنکھ نہ جھپکائی کوئی
ہوش آنے پہ ہوا وہ جو الگ خوابوں سے

حیلہ سازی نے کیا جسم سے پیوست اُس کو
عشق آزاد رہا وصل کے پیمانوں سے

زاہد خان

غزل

اپنے سامان میں اِک رنگِ دخانی رکھ کر
میں بڑھاپے کو اٹھا لایا ، جوانی رکھ کر

رات دریا کی روانی کا عجب منظر تھا
مجھ سے دیکھا نہ گیا آنکھ میں پانی رکھ کر

میں اُٹھا لایا ہوں سب خواب پرانے اپنے
اُس کی دہلیز پہ اِک تازہ کہانی رکھ کر

میں تری سمت نکل آیا مکانِ دل سے
ایک گرتی ہوئی دیوار نشانی رکھ کر

آنکھ کھلنے سے کہیں پہلے چلا جاتا ہے
میرے تکیے پہ کوئی آنکھ کا پانی رکھ کر

لکھنا آجائے گا جس روز خدا جانتا ہے
لفظ لکھوں گا محبت کے معانی رکھ کر

سید تیمور کاظمی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

شہر کا شہر جاں بہ لب ہو جہاں
ایک بیمار کون دیکھے گا!

غزل

میرے قصے جب پرندوں نے سنے اڑنے لگے
کہکشاں کی مثل راہی کو سبھی رستے لگے

ہار کر وہ جان و دل بھی خوش ہیں تیرے شہر میں
عاشقوں کو مہنگے سودے بھی بہت سستے لگے

خود بنے ایندھن چمن میں آگ پھولوں کو لگی
جاگتی آنکھوں کے مجھ کو خواب بھی شعلے لگے

داستاں گو سے شکایت ہی رہے گی عمر بھر
شب نے تو کروٹ نہ بدلی لوگ کیوں سونے لگے

سبز شاخوں پر سلگتے پھول کلیاں دیکھ کر
مندمل جو زخم ہو وہ زخم بھی رسنے لگے

آدمی سب سے مقدم ہے یہی سمجھا ہوں مَیں
عارضی ہر اک ریاضت میں مجھے رشتے لگے

بارہا ایسا ہوا دل سے شہابِ غم اٹھا
دوستوں نے جب سنا پاگل مجھے کہنے لگے

شہاب اللہ شہاب

غزلیں

کس طرح پہچان پائے آئنہ خانہ مجھے
جھریوں سے بھر گیا ہے آپ کا جانا مجھے

آ گیا ہوں میں ادھر تو مجھ کو بے نشہ نہ رکھ
تیری آنکھیں دیکھ کر بھولا ہے مے خانہ مجھے

میں نے صحراؤں کی اب تک خاک چھانی ہی کہاں
کہہ رہے ہیں کس لئے سب لوگ دیوانہ مجھے

راستے کی دھول نے بدلا مرا حلیہ مگر
میری آنکھوں کی چمک سے اس نے پہچانا مجھے

ایک دو پیرے بدلنے سے نہیں پڑتا ہے فرق
پھر سے لکھنا ہے بدل کر پورا افسانہ مجھے

عدنان خالد

سیہ چشما پہننا ہے مجھے
سنو کچھ جھوٹ کہنا ہے مجھے

تمہیں مضبوط رہنا ہے، یہاں
یہاں پھر سے بدلنا ہے مجھے

فرار از یادِ ماضی کے لیے
نیا اک عہد کرنا ہے مجھے

دیارِ عشق سے ملکِ جنوں
تمہارے ساتھ چلنا ہے مجھے

ٹھہر اک پل کو اسپِ زندگی
کہ مٹی پر اترنا ہے مجھے

غزلیں

میں چپ رہوں مرے اندر سے حشر سا اٹھے
وجود کانپ اٹھے درد بے بہا اٹھے

میں اپنے گھر کو میسر کچھ اس طرح سے رہوں
چلا بھی جاؤں تو کمرے سے قہقہہ اٹھے

یقین جانیں یہ توہین ہے محبت کی
ہمارے حق میں اگر کوئی بے وفا اٹھے

میں جینا چاہتا ہوں زندگی تجھے کچھ دن
کوئی تو ہو جو مرے ساتھ مسکرا اٹھے

ساجد رضا خان

نہ آنگن کو کبھی ویران رکھا
تبھی چوکھٹ پہ اک گلدان رکھا

ہر اک شے سے کنارہ کر لیا تھا
محبت کا مگر امکان رکھا

اداسی میرے اندر رچ گئی تھی
سرہانے میر کا دیوان رکھا

جسے جادو گری آتی نہیں تھی
اسی نے عمر بھر حیران رکھا

خدا شناس نہیں ہو سکے ترے بے کار
پھر ایک دن کسی وحشت میں مبتلا اٹھے

جنابِ میر سے ساجد جب اُٹھ نہیں پایا
یہ بارِ ہجر ہے مجھ ناتواں سے کیا اٹھے

کسی نے دل سرائے میں محبت
کسی نے درد کا سامان رکھا

رکھا رندوں سے بھی گہرا تعلق
خدا پر بھی مگر ایمان رکھا

ہوائے تازہ دم آئے گی ساجد
مقفّل گھر میں روشن دان رکھا

غزل

وہ اچھا لگتا ہے دل کو بھاتا ہے، ایک مخصوص زاویے سے
وہ تیر نظروں کے بھی چلاتا ہے، ایک مخصوص زاویے سے

ادائیں اس کی، جفائیں اس کی، وہ اس کا ہنسنا، وہ مسکرانا
ملا کے نظریں بھی وہ چراتا ہے، ایک مخصوص زاویے سے

حسین اتنا، جمیل اتنا، وہ ہے کہ ہائے، میں کیا بتاؤں
جفائیں بھی گر کسی پہ ڈھاتا ہے، ایک مخصوص زاویے سے

دلانِ عشاق پر قیامت سی اِک گزرتی ہے بے رخی سے
نظر نظر سے بھی وہ ملاتا ہے، ایک مخصوص زاویے سے

اسے خبر ہے، سبھی بخاری، وہ جانتا ہے، ذہین ہے وہ
لگی وہ من کی بھی تو بجھاتا ہے، ایک مخصوص زاویے سے

اسیر ہوتے ہی ہم نے دیکھا ہے کتنے عاصم بڑے بڑوں کو
وہ زلف شانے، پہ بھی سجاتا، ہے ایک مخصوص زاویے سے

عاصم بخاری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چاہتیں کب ہیں صرف باتیں ہیں
جانِ جاں کوئی جان وارے بھی

غزل

خواب بس زندگی سے ہوتے ہیں
"سلسلے تو سبھی سے ہوتے ہیں"

تم نے سمجھا ہے غیر اچھا ہے
رشتے کب ہر کسی سے ہوتے ہیں

کیا کہا ہم بھی بھول جائیں گے
کام یہ بس تبھی سے ہوتے ہیں

اشک آنکھوں میں آگئے ہیں کیوں
رابطے دل لگی سے ہوتے ہیں

وقت آخر گزر ہی جاتا ہے
دکھ تو وابستگی سے ہوتے ہیں

تم نے چھوڑا کہ میں نے چھوڑا ہے
فیصلے کچھ خوشی سے ہوتے ہیں

کاش کچھ تم نے بھی کہا ہوتا
فاصلے ان کہی سے ہوتے ہیں

نائلہ راٹھور

غزل

اک ساتھ آسماں میں اڑیں گے یہ طے ہوا تھا
اک ساتھ ہم جئیں گے مریں گے یہ طے ہوا تھا

ہر پل ہنسیں ہنسائیں گے ہر روز و شب گھڑی
پھر آہ بھی اکٹھے بھریں گے یہ طے ہوا تھا

اک دوسرے کو دھکا نہیں دیں گے ہم کبھی بھی
باہم جنوں میں آگے بڑھیں گے یہ طے ہوا تھا

بے خوف ہم رہیں گے جہاں بھی سیاہ شب میں
اللہ کے سوا نہ ڈریں گے یہ طے ہوا تھا

ہم حرف حرف دیں گے گواہی رفاقتوں کی
تفسیرِ حسن پھر سے لکھیں گے یہ طے ہوا تھا

ٹھوکر ہر اک قدم پہ ہے فاروق منتظر
سر ہم مسافتوں کو کریں گے یہ طے ہوا تھا

زبیر فاروق

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جاگ رہا ہے تُو مجھ میں
یا ، تیری خو بو مجھ میں

غزل

بات کا کچھ اثر نہیں ہوتا
ہو بھی سکتا ہے پر نہیں ہوتا

کچھ پرندے پلٹ کے آتے ہیں
کچھ پرندوں کا گھر نہیں ہوتا

بے قراری میں ہم کہاں جائیں
تیرے بن تو سفر نہیں ہوتا

دل کو آباد کر لیا غم نے
تم سے اتنا مگر نہیں ہوتا

وہ جو حق بات پر ٹھہر جائیں
ان کے کاندھوں پہ سر نہیں ہوتا

ایک مدت سے تیرے بن میرا
ایک لمحہ بسر نہیں ہوتا

چاک سینہ ہو یا کہ دامن ہو
اہل دل پر اثر نہیں ہوتا

ان درختوں پہ نام مت لکھنا
جن پہ کوئی ثمر نہیں ہوتا

دوست جس کے ہوں وہ ہے شاہِ جہاں
ان سے بڑھ کر تو زر نہیں ہوتا

رجب علی رجب

غزل

چاہتوں کا گماں ضروری تھا
عشق ہوتا عیاں ضروری تھا

آنکھ روتی ہوئی بتاتی ہے
جانے والا یہاں ضروری تھا

اے اُداسی تجھے بھی رہنے کو
مرے دل کا مکاں ضروری تھا؟

وقتِ مشکل تجھے پُکارا تھا
تیرا آنا وہاں ضروری تھا

مجھ کو میرے خدا بُڑھاپے میں
ایک بیٹا جواں ضروری تھا

زندہ رہنا تھا سو عدالت میں
میرا جھوٹا بیاں ضروری تھا

باپ رُوٹھا تو یہ کہا ، مالک!!
سر پہ اِک سائباں ضروری تھا

ہر مُصیبت کو ٹالنے والا
ماں ، ترا آشیاں ضروری تھا

جانے والے کو دیکھنا تیرا
اے مری جانِ جاں ضروری تھا

ایک مُدّت کے بعد جانا ہے
کون، کتنا، کہاں ضروری تھا

طلحہ ، تجھ سے اُداس لوگوں کا
ایک علیحدہ جہاں ضروری تھا

طلحہ غفور

غزل

تمھاری یاد کے اس نیلے آسمان تلے
ہماری خاک ہی نکلے گی خاکدان تلے

یہ بام و در کی خموشی بتا رہی ہے مجھے
کہ جیسے قبر ہو کوئی مرے مکان تلے

مرا سوال ہے تجھ سے اگر بُرا نہ لگے
میں اور جہان بنا لوں ترے جہان تلے؟

پہاڑ کاٹنے نکلے تھے تیرے عشق میں جو
وہ دفن ہو نہ گئے ہوں کسی چٹان تلے

یہ جس نشان کو منزل سمجھ رہے ہو عظیم
نشان اور بھی ممکن ہے اس نشان تلے

فخر عظیم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بند دروازہ تھا خالد ، یا عبادت گاہ تھی
اس کے در پر سارے بے کس، سارے گھر سو گئے

غزلیں

ترا خیال تو کارِ ثواب ہو جیسے
ترا ہی ذکر یہ دل کا نصاب ہو جیسے

طوافِ یار کی خاطر نظر وضو میں رہے
وہ ایک چہرہ مقدس کتاب ہو جیسے

ترے جمال سے تتلی کو رنگ روپ ملے
حسین عارض ولب ہیں، گلاب ہو جیسے

جہاں جہاں سے تو گزرا مہک گئے رستے
ترا ہی لمس بھی خوشبو کا باب ہو جیسے

عزیز قدیر مغل

مجھے اشکوں سے وحشت ہو رہی تھی
جدائی پر وہ پگلی رو رہی تھی

میں خاموشی کے مطلب کو نہ سمجھا
نمی آنکھوں میں اس کے تو رہی تھی

وہ محرم بن رہا تھا اجنبی سے
کئی رشتے مگر وہ کھو رہی تھی

سہانی رت کے سپنے دیکھتی تھی
محبت دل میں خوشیاں بو رہی تھی

تمہارے وصل کی باتوں سے دل ہے رقص کناں
سرور و کیف ہے اتنا شراب ہو جیسے

عزیز ہار کے جیون تمہیں بھی پا نہ سکا
بسی ہو آنکھ میں اب کوئی خواب ہو جیسے

وفاؤں کی نہ میں نے قدر جانی
مری عقل و خرد تب سو رہی تھی

میں دوری کر بھی لیتا آج اس سے
مگر اک فکر بھی مجھ کو رہی تھی

کائنات کا جنم [کہانی]

سنو، پری۔
رستہ ڈھونڈنے نکلی ہو؟
کہاں کا؟
یہ دنیا تو کہکشاں کی وسعتوں میں ایک ذرہ ہے۔
جانتی ہو یہ ''ذرہ'' کب وجود میں آیا؟
یہاں تھا کیا پہلے۔
صرف دھواں
یہ زمین تھی، نہ اس کا کوئی آسماں
ساری فضا بے نور۔
سورج اور چاند اُس وقت پیدا نہیں ہوئے تھے۔
یہ پندرہ ہزار ملین سال پہلے کی بات ہے۔
سمجھو کل ہی کا قصہ ہے۔
ہوا یوں کہ دھویں کا گول گھومتا بگولہ اک زوردار دھماکے سے پھٹا۔ دھماکا اتنا ہولناک تھا کہ کائنات میں نہ کبھی پہلے اتنا ہوش رُبا خوفناک دھماکا ہوا، نہ شاید کبھی پھر اُتنا زبردست دھماکا ہو۔
سوائے اُس وقت، جب کائنات کا طنبو تاننے والا، خود اس کی طنابیں نہ کھینچے۔
دھویں کا بادل ایسی گرج سے پھٹا کہ کائنات، جسے ابھی جنم لینا تھا، وہ اک عظیم آگ کا گولہ بن کے گھومنے لگی۔ ناچنے لگی۔
دیکھ پری، ساری کھیڈ ہی رقص سے شروع ہوئی، اِسی پہ ختم ہوگی۔
تم رقص کو برا نہ کہنا، ناچے بغیر اندر کے بند نہیں کھلتے، نا باہر کی بند آنکھیں اندر تک تکتی۔
سمجھی، پری۔
صدیوں تک وہ آگ کا عظیم گولا گھومتا رہا۔
اُس گھومتے آگ کے بگولے سے ''ذرے'' نکل نکل کے پھیلنے لگے۔ اُس بگولے سے نکلے تھے، اُسی کے گرد گھومنے لگے۔
اُن نکلے ذروں میں سے ایک ہمارا ''سورج'' بھی تھا۔ آگ اُس میں اُچھل رہی تھی۔
ناچ رہی تھی۔
ایسے ہزارہا ذرے، ''سورج'' سے بھی بڑے بڑے اُس آگ بگولے سے نکل کے اُسی کے گرد گھومنے لگے۔ ناچنے لگے۔
وہ رقصِ رومی دیکھا! گول گھومتے ایک دائرے میں۔ دیکھ پری، یہ بات سمجھ، جہاں کوئی مرکزی نقطہ ہو، دائرے کی پرکار اُنی اُسی کے گرد گھومتی ہے۔ اب مرضی ہے، مرکزہ بنو، یا گھومتا دائرہ۔ رقص میں دونوں ہوتے۔
پھر یوں ہوا۔
کہ ہمارا سورج گھومتے گھومتے خود پھٹ گیا۔ اُس سے نکلنے والے ذرے آگ

ابدال بیلا

پہنچے اُسی کے گرد گھومنے لگے۔
اصول طے ہو گیا۔
جو جس مرکز سے نکلے، اُسی کے گرد گھومے۔
سورج سے نکلنے والے ذرّوں میں اک ذرہ
ہماری دنیا تھی۔
اب سمجھی بات؟
یہ دنیا بھی آگ کا مسکن تھی۔
دنیا ہماری بھی اک بار پھٹی۔ اس سے ہمارا
''چاند'' نکلا۔
چاند زمین کی کوکھ سے نکلا تھا۔
اس لیے یہ ہماری دنیا کے گرد گھومنے پہ مجبور ہے۔
ناچنے پہ پابند۔
ہر جدا ہونے والا ''ذرہ'' خود بھی گول گھومتا ہے اور
گھومتے گھومتے، اسی دھمال سے، جس سے جدا ہوا
اُس کے گرد بھی گھومے جانے پہ تُلا ہوا ہے۔
دیکھ، گول گھومنے میں اک راز چھپا ہوا۔
کوئی ٹیڑھا میڑھا چاروں کونوں سے چبھنے والا
''کھنگر'' قسم کا بھدا بدہیئت مدتوں گول گھومتا رہے،
تو وہ خود بھی ''گول'' ہو جاتا۔ کسی کو نہیں چبھتا۔
آئی سمجھ، پری!
یہ اہم بات۔
کہنے کو اس وقت سب میں ایک ہی چیز۔
آگ
آگ دھوئیں کے بگولے سے دھماکا بن کے
پھٹتے جانے کے بعد، دور ہٹے جانے والے
ہر ''ذرے'' ہر ''سورج'' ہر ''ستارے'' کے
پیٹ میں اب بھی موجود ہے۔
ہماری ''دنیا'' کے اندر پیٹ میں اب بھی
''آگ'' کھول رہی ہے۔ کبھی کبھی یہ ''اندر''
سے اوپر کی جھلی توڑ کے اُبل بھی جاتی ہے۔ ہم
کہتے ''آتش فشاں'' پھٹ گیا۔ اندر کا پگھلا
سیال آگ کا دریا بن کے اچھل پڑتا ہے۔
آگ زمین کے اندر ہی نہیں چھپی ہوئی،
پری، زمین پہ چلنے پھرنے والوں کی آنکھ
میں بھی بڑھکتی دِکھتی، کبھی کبھی، دیکھا؟
''آگ'' کائنات کے ہر سورج، ستارے
اور ہماری زمین میں موجود۔
اُبل رہی ہے اب بھی۔
ناچ رہی ہے اب تک۔
یہ کائنات بھر کے سورج، ستارے اور زمینیں
سب کیا ہیں۔
انگریزی میں اسے ''میٹر'' کہتے۔
اپنی زبان میں اسے ''مادہ'' کہہ لو۔
''مادہ'' کہنے میں ایک قباحت ہے۔
ہماری کم عمر زبان میں لفظ ''مادہ'' ''فی میل''
کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ نہ ''میل''
ہے نہ ''فی میل''۔ یہ وہ ہے جس سے ہر موجود
شے کا وجود ہے۔
یہ ''وجودیت'' کا پرتو ہے۔
یہ ''مایا'' ہے۔
سب میں آگ اُبل رہی ہے۔
ناچ رہی ہے۔
مگر ''آگ'' تو اس کا جسم ہے۔
جس کا نام لینے سے پہلے میں خدا کی پناہ
میں آتا ہوں، پناہ مانگتا ہوں اپنے رب کی
کہ وہ ''آگ'' مجسم اپنے شر سے مجھے

مغلوب نہ کرے۔
اب سمجھ آئی بات۔
''کائنات'' بنانے والے نے، کائنات کے
ہر ستارے، ہر سورج، ہر زمین کے اندر اُس
کے پیٹ میں ''آگ'' رکھی۔
تبھی تو آج تک اِس زمین پہ پلنے والے انسان
ابھی تک اپنے پیٹ میں ''آگ'' پالتے ہیں۔
تبھی اُن انسانوں کی آنکھ اندر آگ اچھلتی ہے۔
جانتی یہ کون لوگ ہیں؟
یہ سورج کی طرح وہ بدنصیب ہیں۔
جن کے اندر کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوتی۔
یہ جلتے ابلتے دیکھے جا سکتے ہیں۔
تم اس آگ کو ''حسد'' کی آگ کہہ لو۔
''کروڈ'' اور دشمنی میں جلتے ہوئے سمجھ لو۔
''آگ'' جہاں بھی ہے
یہ اُس کا حصہ ہے
جو آگ سے بنا
جس کا نام لینے سے پہلے میں پناہ مانگتا
ہوں، کائنات کی ہر شے کو تخلیق کرنے
والے خدا کی، جو واحد اور یکتا ہے۔ جسے کسی
نے جنم نہیں دیا، نہ اُس نے کسی کو جنم دیا۔
''آگ'' کس میں ہے، ''میٹر'' میں
''مایا'' میں۔
موجودیت کی ہر شے میں
جس کی طلب میں آج بھی انسان پاگل ہوا
ہوا ہے۔ یہ لے لوں۔ وہ بھی۔ سب جس تک
دسترس ہے۔ وہ بھی جو دسترس سے باہر ہے۔
سمجھ آئی کہانی؟
پناہ مانگتا ہوں اپنے سچے رب کی۔
جس نے شیطان کو اجازت دی کہ وہ ہر انسان
کے رستے میں جا سکتا ہے۔ اُسے ورغلا سکتا
ہے۔ کر سکتا ہے اپنا وار۔ بھٹکا سکتا ہے رستہ
سے، سوائے اُن کے جن پہ خدا نے اپنی خدائی
کا ہاتھ رکھا ایسا کہ اُن پہ اُس کا وار نہ چلے گا۔
بھٹکانے کی کوشش وہ ہر کسی پہ کر سکتا ہے۔
جسے خدا بچائے وہ بچ جاتا۔
بھٹکاتا، ورغلاتا وہ کس ''شے'' کے لیے۔
''مایا'' کے لیے۔
''میٹر'' کے لیے۔
کہنے کو بظاہر اب وہ ''آگ'' نہیں لگتی۔
ہے ''آگ'' ہی۔
ہماری یہ دنیا بھی، جو چار ارب پچپن کروڑ سال پہلے
پیدا ہوئی تو اس کے گرد بھی دھول مٹی میں آگ کی
چنگاریاں تھیں۔ خود بھی یہ گول گھومتی ہوئی آگ کا
گولا۔ گھومتے گھومتے یہ چٹانوں اور دھاتوں کی
پگھلی ہوئی شکل میں رقص کرتی رہی۔
ناچتی رہی۔
دھمال ڈالتی رہی۔ گھوم گھوم کے ناچتے سمے
کیا ہوتا؟
جو ''کم وزن'' تیرتا سیال ہو، وہ اوپری سطح پہ
آ جاتا۔ اوپر کی جگہ، باہر باہر، سطحی حصہ
ہولے ہولے ٹھنڈا ہونے لگتا۔
تم گول گھوم کے، ناچ کے دیکھ لو۔
تمہارے ''من'' میں تمہاری دھیرج کے
حوالے سے، جو بھی آسودہ خیال ہوں گے،
وہ تمہارے انگ انگ سی ہویدا ہوں گے۔

ایسا ہی دھرتی ماں کے ساتھ ہوا۔
اوپر اوپر سے زمین کچھ ٹھنڈی ہوئی۔
اندر "آگ" پیٹ میں کھولتی رہی۔
اوپر زمین کا حصہ، اس کھولتی گیند کا چھلکا،
جانتی کتنا موٹا؟
چالیس میل۔
ان "چالیس میل" حصے میں ہمارے پہاڑ،
ہمارے صحرا، ہمارے میدان دریا اور
سارے سمندر ہیں۔
شروع شروع کے کروڑہا سال، ہماری زمین
بے آباد تھی۔ یہاں نہ "پانی" تھا۔ نہ سانس
لینے والی "ہوا"۔ کوئی یہاں کیسے جیتا۔
اوپر "آسمان" سے گرتے "شہاب ثاقب"۔
سورج کی خطرناک لہروں سے بچاؤ کے
لیے بھی اس زمین کے گرداگرد کوئی حفاظتی
حصار نہ تھا۔ اندر اس کے آتشی سیال کھولتا
رہتا۔ اندر جب تک یہ زمین کے پیٹ میں
رہے، پری، اسے "میگما" کہتے، اچھل کے
زمین پہ آگ کا دریا بن کے بہے تو "لاوہ"
یہ "لاوہ" ٹھنڈا ہو کے جم جائے تو "چٹان"۔
پری، یہ میں کوئی "سیکسوئیکل" باتیں نہیں کر رہا۔
زمین اور کائنات کی "تخلیق" بارے بتا رہا۔ یہ
تم سوچو کہ ہر تخلیق پہ یہ بات کیسے پوری ہوتی۔
میری بات سن کے اٹل نہ جانا، پری!
دیکھو، سارے نقاب اٹھنے کے بعد اچھلتے،
اترتے۔ یوں سمجھو زمین چاروں طرف سے
گھونگھٹ اوڑھ کے ناچتے گھومنے لگی۔
ڈھیرے ڈھیرے یہی بھاپ کے بادل
گھیرے ہوئے۔ دبیز ہوئے۔ ان میں بھی
گھن گرج ہوئی اور یہ برس پڑے۔
تم بھی یوں برس جاتی۔ بے تا پری!
صدیوں تک ہماری زمین پہ بارش ہوئی۔
زمین کے نشیب کو ان برستی بارش نے
دریاؤں کی صورت اپنا "رستہ" بنالیا۔
تب اُن پانیوں نے ہماری زمین کے اوپری چالیس
میل تک گہرے حصے کو سمندروں میں بدل دیا۔
ہماری دھرتی کا خشک حصہ ہمیشہ سے ایسا
نہیں تھا۔ جیسا اب ہے۔
سنو۔
زمین کا اوپری خشک حصہ شروع میں جڑا جڑا تھا۔
جڑے زمین کے حصے، گھومتی زمین میں کبھی
قریب ہوتے، کبھی دور۔
انہی ٹکڑوں کے اپنی الگ اکائیوں کی وجہ
سے دنیا کے سات براعظم بنے، آٹھواں ٹکڑا
چھوٹا سا، نیوزی لینڈ۔
دیکھو پری، خشکی کے ٹکڑے سمندروں میں اپنے پیندے
سے کہاں تک سمندر کی گہرائیوں میں گئے ہوئے!
ان کو ذہن میں رکھ کے چالاک دنیا کے سائنس
دانوں نے اپنے ملکوں کی سمندری حدود بڑھالیں۔
تمہیں ساری بات بتاؤں گا۔
پہلے یہ سمجھو، یہ زمین کے خشک ٹکڑے، جن پہ
ساری دنیا کے ملک آباد، پہاڑ، صحرا، جنگل،
میدان، دریا، یہ سب بنے کیسے؟ سب کچھ
یہ زمین کے اوپری "چالیس میل" میں۔
اس حصے میں بڑی اچھل کود ہوئی۔
کبھی "قالین" فرش پہ بچھایا؟

اُس ''بچھے قالین'' پہ شرارتی بچے ادھم مچاتے دیکھے؟ کبھی وہ قالین کو ایک طرف کھینچتے۔ کبھی اُسے کسی جگہ پہ اکٹھا کر دیتے۔

''قالین'' بچھا ہوا، کہیں سے ''اکٹھا'' ہو جائے تو کیا ہوتا؟

''اُدھر'' سے ابھر جاتا۔

یوں ہمارے ''پہاڑ'' بنے۔

دھرتی کے خشک حصے بھی کہیں سے جڑتے، کہیں سے ٹوٹ کے کہیں دور جا رکتے۔

تم نے ''جنوبی امریکہ'' اور ''افریقہ'' کا نقشہ دیکھا؟

یہ ایک ہی حصے کے دو جڑواں بھائی۔ اب اُن کے درمیان ہزاروں میل کا سمندر۔

میں بھی کبھی تمہارے ساتھ یونہی جڑا ہوا تھا۔

جدا کرنے والوں نے تمہارے اور میرے بیچ جدائی کا کتنا بڑا سمندر حائل کر دیا۔

یہ سمندر کبھی ''وقت'' کا لگتا۔ کبھی ''زمین'' کا۔

مگر میں اب بھی تم سے جڑا محسوس کرتا ہوں، تم کتنی بھی دور ہو جاؤ، تمہیں تمہارا وجود بتائے گا کہ تم میرے شریر کا حصہ تھی، اب بھی ہو۔

تم اور میں ایک ہی روح میں پروئے ہوئے ہیں۔ مگر تمہیں ''روح'' کا خیال کیسے آئے۔

حالانکہ جسموں میں پرونے سے کہیں پہلے ہم ''روح'' ہی تھے۔

اور پاس پاس بیٹھے تھے۔

یاد آیا؟

جب ہمارے رب نے پکارا تھا۔

پوچھا تھا۔

کہ تمہارا رب کون؟

کون تمہیں پالنے والا؟

ہم سب نے۔

تم نے اور میں نے یک زبان ہو کے کہا تھا،

خدا کو کہ تو ہی ہمارا رب ہے۔

ہمیں پالنے والا۔

پھر ''وہ'' درمیان میں آ گیا۔

پناہ مانگتا ہوں اپنے رب کی، اُس کا ذکر کرنے سے پہلے، جس نے ہمیں اُس کی ''آگ'' اپنے پیٹ میں بھرنے کو اُکسایا۔

ہر ''میٹر''، ہر مادہ، ہر مادی شے، مایا، کیا ہے؟

''آگ''

اسی کو مانگنے والے

اسے تلاش کرنے والے

اس کے حصول میں جتے لوگ

اسی میں جلتے آئے ہیں

اسی میں جلتے جائیں گے۔

اب سمجھ آئی، پوری بات؟

مگر بات ابھی پوری بتائی کب۔

سنو۔

یہاں تیرے اور میرے آنے سے ہزارہا سال پہلے پانی میں زندگی کے جرثومے بنے۔

شروع میں بس ایک ایک خلیہ زندگی جیتا تھا۔

یہ خلیے جڑنے لگے۔

کوئی چالیس ہزار ملین سال پہلے، زمین کی سطح پہ آتشی سیال سے زہریلی ہوائیں نکلی۔ یہ زہر بھری ہوا، سمندروں کے پانی میں ملی تو اک عجیب سا ''کیمیائی سوپ'' بنا گئیں۔ اس کیمیائی محلول کے اندر کچھ ایسے انہونے جوڑ توڑ ہوئے کہ انہوں

نے آپس میں جڑ کے اک ایسی شے بنا دی، جو زندگی کی ضامن ہے۔ جانتی وہ شے کیا تھی؟
وہ تھی ''پروٹین''۔
اس ''پروٹین'' نے زندہ خلیے بنائے۔
پری
تمہیں تو پتہ وہ زندہ خلیوں کا آغاز۔
''پروٹین'' رنگ برنگے موتی سمجھ لو۔
ان کا دوہرا ہار۔ سانپ کی شکل میں جس کے گلے پڑ گیا۔ اُسے زندگی مل گئی۔
پتہ یہ ہے کیا؟
ڈی این اے۔
اس ''ڈی این اے'' کا دوہرا ہار اکیلا ہو تو وہ آدھا زندہ۔ وہ ''آر این اے'' آدھا زندہ یوں کہ اسے پلنے اور پھلنے کے لیے کسی زندہ جسم کی ضرورت۔ اس جسم میں یہ کسی راہ سے گھس جائے۔ تو اُسی کے خلیوں کو ''ہائی جیک'' کر کے چل سو چل۔
پتہ یہ کیا؟
''وائرس'' جیسے آج کا ''کرونا''
کائنات کا پہلا زندہ خلیہ بننے سے پہلے ''وائرس'' اچھلا۔ ''پروٹین'' اس کی دوہری ہوئی تو ''ڈی این اے''۔ اُدھر سے زندگی کا چراغ جلا۔
سمندر میں شروع شروع کے زندہ خلیے بنے۔ جانتی سمندر کی تہہ میں بھی ''مٹی'' ہوتی۔ وہی ''مٹی'' سمندر کی تہہ سے بلبلے بن کے ابھری اور زندگی کی نمو ہوئی۔
تمہیں ابھی ایک ''خلیے'' کے جنم کی بات بتائی۔
جانتی ''انسان'' میں ایسے کتنے خلیے ہوتے؟
''تین سو ٹریلین'' خلیے۔
اردو میں اتنی گنتی کے لیے کوئی لفظ نہیں بنا،
جتنے خلیوں سے تم اور میں وجود میں آئے۔
پہلے پہل خلیوں کے جوڑ سے کوئی زندہ کونپل بنی۔ اُس سے کوئی پتا بنا۔ اُس کی جڑ بنی۔
ہزار ہا ملین سالوں بعد ایسے خلیوں سے کوئی ایسا جاندار بنا جس کی جڑ اُسی کے اندر تھی، جو چل پھر سکتا تھا۔ ہل جل سکتا تھا۔
جانتی وہ کونسی شے تھی۔
اُسے تم ''مچھلی'' کہہ لو۔
تو اب سمجھ لو، مان لو۔
یہ پیڑ پودے، شجر درخت یہ گھاس جھنکار ہمارے سب سے قدیمی اجداد ہیں۔
ان کے بعد پھر ہماری جد میں مچھلیاں ہیں۔
جہاں پانی کم ہوا، صدیوں تک اُن پانی میں گھومتی مچھلیوں کے گل پھڑوں کے ساتھ ساتھ پھیپھڑے بھی بن گئے۔
وہ پانی سے باہر بھی سانس لینے لگیں۔ اُن کے چھوٹے چھوٹے پَر، پیر بن گئے۔ پہلے ''پیٹ'' کے بل رینگنے والے جانور بنے۔
پھر چار ٹانگوں سے چلنے والے۔
مگر ''دو ٹانگوں'' سے چلنے والا ''انسان'' ان سے نہیں بنا۔ یہ آسمان سے اترا، جیسے اس زمین پہ ''انسان'' کو اپنا ''نائب'' بنانے والے خدا نے ہزار ہا سال تک آسمان سے خزانے اتارے۔
لوہا اتارا۔
لوگ کہیں گے شہاب ثاقب گرا۔
اب یہ گریں تو آگ کا گولہ بن کے خود مٹ جاتے ہیں کیونکہ زمین کے گرداگرد حفاظتی حصار ہے۔
تم ''اوزون'' اسے کہہ لو۔

اب تم اور میں اسی حفاظتی حصار کو توڑنے میں لگے ہیں۔

دیکھ

انسان اس دھرتی پہ سب سے آخر میں آیا۔

تمہیں کہا تھا نا کہ یہ زمین چار سو پینتالیس کھرب سال پرانی۔

تم اس سارے عرصے کو "ایک سال" سمجھ لو۔

جنوری گزر گیا۔

انسان نہ آیا۔

فروری، مارچ، اپریل، مئی بھی گزر گیا۔

انسان نہ آیا۔

جون، جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر

سب گزر گئے۔

انسان نہ آیا۔

نومبر بھی گزر گیا۔

دسمبر چڑھ گیا۔

اُس کی پہلی، دوسری، تیسری تاریخ گزر گئی۔

انسان نہ آیا۔

دسمبر کی آخری تاریخ آ گئی۔

اکتیس دسمبر کی صبح۔

انسان نہ آیا۔

اُس دن کا سارا حصہ گزر گیا۔

انسان نہ آیا۔

رات پڑ گئی۔

رات بارہ بجنے میں ایک سیکنڈ رہ گیا۔

تب انسان آسمان سے اترا۔

دیکھ۔

ایک "سیکنڈ" پہلے اترے انسان نے اپنی "ترقی" کی آڑ میں، زمین کا کیسا حلیہ بگاڑ دیا۔

"حفاظتی حصار" کا کمبل جگہ جگہ سے پھاڑ دیا، داغدار کر دیا۔

گلیشیئر پگھلا دیے۔

دھویں، دھول، مٹی اور زہر سے یہ ساری دھرتی بھر دی۔ خود صرف جینے کی آرزو میں باقی سب کو مارنے پہ تل گیا۔

تم پوچھو گی، کیوں؟

میں اُس کا نام لینے سے پہلے

پناہ میں آتا ہوں، اپنے خدا کی۔

جو ہر شے کا خالق اور مالک ہے۔

اُس کا بھی خدا ہے جو ہر انسان کو تخریب کی طرف آمادہ کرتا ہے۔ جو "آگ" ہے، اور مٹی سے بنے انسان کو بھی "آگ" میں پرو کے، اُس کو آگ کا ہی متلاشی بناتا ہے۔ تبھی ہم تم، اور ہمارے جیسے دوسرے "بندے" یہ بھول کے، کہ خود مٹی سے بنے ہیں اور اسی مٹی میں آخر "ری سائیکل" ہونا ہے، "آگ" جمع کرنے میں لگے ہیں۔

کیونکہ "مٹی" سے بنے اس "بندہ" کا "رستہ" آگ نے کاٹا ہے وہی اپنی طرف بلاتا ہے کہ آ، میرا کہا مان۔ دنیا کا لوہا لکڑ جمع کرتا جا۔ جمع ہوا مال خرچ نہ کر۔ اپنا پیٹ بھرتا جا، جو کبھی نہ بھرے گا، چاہے پوری دنیا کی آگ بھر لو۔

اس لیے اُس کا ذکر کرنے سے پہلے خدا کی پناہ میں آ جایا کرو پری۔ پناہ مانگتا ہوں، خدا کے رستے کی، کہ کوئی مجھے خالق کے دیے رستے سے نہ توڑے۔

☆☆☆☆☆

مائیں نی میں کیہنوں آکھاں

مرجھائے چہرے اور پھٹی آنکھوں والی ایک مغموم تصویر کو دیکھ کر احساسات کی ایک رو۔

پختہ اینٹوں سے تعمیر شدہ ایک کوٹھڑی ہے لیکن اُس کے اندر کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا ہے جہاں سے بھی یہ اکھڑا ہے وہاں سے سیمنٹ کی تہوں نے جاتے وقت کچھ ایسی شبیہیں دے دی ہیں جو بڑی ہیبت ناک شکلیں اختیار کیے ہوئے ہیں ۔ اس میں مدھری روشنی ہے جو اندھیرے سے گتھم گتھا ہے ۔ شاید یہ اندھیرے پر غالب آنے کی کوشش میں ہے لیکن ایک لاغر سی روشنی بھلا اس قوی ہیکل اندھیرے کو کیسے زیر کر سکتی ہے۔

اس کوٹھڑی کا باہر کی دُنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں اس میں ایک ایسی کھڑکی نصب کی گئی ہے۔ کھلنے پر جس کا تعلق باہر کی دنیا سے جُڑ جاتا ہے۔ شاید یہ اس لیے بیرونی دیوار میں رکھی گئی ہے تا کہ جب یہ کھڑکی کھلے تو اس کا مکیں جب باہر کے مناظر کو نظر بھر کر دیکھے تو اس کے دل میں پھر سے کھلی فضا میں سانس لینے کی خواہش جاگے ۔ ہو سکتا ہے ایسا ہونے پر وہ مکیں اپنے تمام نہ کردہ جرموں کے آگے سر تسلیم خم کر دے۔

اس کوٹھڑی کے مغربی سمت میں ایک کبیدہ خاطر خاتون ہیولے کی صورت سکڑی سمٹی بیٹھی ہے جس کے آدھے سر پر دوپٹہ ہے اور آدھا سر ننگا ہے۔ یہ ننگا کیوں ہے اس کا اس ہیولے کو کوئی احساس نہیں۔ اس کے سر کے بال خشک اور اُلجھے ہوئے ہیں۔ وہ گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے مشرقی سمت کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہے ۔ اس کے بیٹھنے کے انداز سے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کسی نے اس کے وجود کو جکڑ رکھا ہے۔

اندھیری رات کا پہلا پہر گزر چکا ہے۔ اس تنگ و تاریک کوٹھڑی سے باہر آسمان کو گہرے بادلوں نے ڈھانپ رکھا ہے۔ بادلوں کے پیچھے چاند اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا ہے مگر بادلوں کی دبیز تہوں کی وجہ سے اُس کی روشنی زمین تک نہیں پہنچ پا رہی۔

رات کے اسی گھپ اندھیرے میں ایک سفید چمڑی والا بوڑھا قانون دان اس کوٹھڑی میں دبے پاؤں داخل ہوتا ہے جب وہ اس خاتون کی جانب قدم بڑھاتا ہے تو وہ خاتون ایک جھٹکے سے اپنا سر بلند کرتی ہے اور اس کی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگتی ہے۔ لیکن چند لمحوں بعد وہ پھر اپنی ٹھوڑی گھٹنوں پر ٹکا دیتی ہے اور پھر سے

حنیف باوا

مشرقی کمر پر اپنی نگاہیں مرکوز کر دیتی ہے۔
جب وہ بوڑھا قانون دان لاغر سی روشنی والے بلب کو بجھا کر زیادہ پاور والے بلب کو آن کرنے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے تو وہ ہیولا صورت عورت چیخ اٹھتی ہے
"نہیں...... مجھے یہاں زیادہ روشنی نہیں چاہیے مجھے اس سے خوف آتا ہے۔ پلیز اسی بے بضاعت اُجالے کو ہی رہنے دیجیے میں اسی میں خوش ہوں۔"
قانون دان کا بڑھا ہوا ہاتھ وہیں رُک جاتا ہے۔ وہ جب اسی مہین سی روشنی میں اس ہیولے کو دیکھتا ہے تو اسے پہلی بار یہ احساس ہوتا ہے کہ اس خاتون کا وجود جوانی کی حدود سے باہر قدم رکھ چکا ہے لیکن خوبصورتی اب بھی اس کے ملول چہرے کے ساتھ چپکی ہوئی ہے لیکن اس کے گلاب چہرے میں خوف اور سراسیمگی نے جیسے ہلدی گھول رکھی ہو پر اس کی آنکھوں کی جوت میں ایک موہوم سی لکیر اب بھی باقی ہے جو انھیں روشن رکھے ہوئے ہے لیکن اس کی باچھیں اور کانوں کی لویں ایسے ویران ہیں جیسے وہ کسی جنگل کے ایسے پیڑ ہوں جس کی تمام پتیوں، سرسبز ٹہنیوں کو اپنے ہی دیس کی آگ اُگلتی ہواؤں نے ڈھلتے سورج کی آماجگاہ لی اور اسے اٹھنے والے خونی جھکڑوں کے حوالے کر دیا ہو اور ان جھکڑوں نے ان کی تمام ہریاول کو چاٹ کر انھیں سونا کر دیا ہو۔
اس بوڑھے قانون دان کے بال کھچڑی اور چھڑی انڈے کے خول کی طرح سفید ہے جس نے وہی لباس پہن رکھا ہے جو اس قبیل کے قانون دان کے لیے مخصوص ہے۔
"محترمہ جیسے آپ کو معلوم ہے مجھے شہنشاہ وقت نے آپ کو قانونی تحفظ فراہم کرنے کے لیے یہاں بھیجا ہے۔"
اب کی بار محترمہ سر نہیں اٹھاتیں بلکہ بار بار کی اُگلی ہوئی اس بات کو کوئی اہمیت نہ دیتے ہوئے مسلسل مشرقی کونے کی جانب جھانکتی رہتی ہے۔
"بی بی۔ میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"
وہ اس سکڑی سمٹی خاتون کے دائیں جانب جھکتے ہوئے کہتا ہے وہ اس کو سنی ان سنی کرتے ہوئے بدستور اپنے لب ایک دوسرے میں پیوست کیے رکھتی ہے۔ وہ تیزی سے تھوڑی کو گھٹنوں سے الگ کرتے ہوئے اس کھچڑی بالوں والے قانون دان کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی ہے جیسے کہہ رہی ہو۔
"بوڑھے قانون دان۔ بار بار کی اُگلی ہوئی باتوں کا میں تمھیں کیا جواب دوں۔ پہلے آپ کا شہنشاہ سفید دامنوں پر جرموں کا گند ڈالتا ہے، پھر انھیں دامنوں کو سوالات کی متعفن پھوار سے دھونے کے لیے تم جیسوں کو اس کال کوٹھڑی میں بھیج دیتا ہے۔ خدا کے لیے اس گھناؤنے کھیل کو بند کریں۔"
کوٹھڑی کے اندر اندھیرے کی حکومت بدستور قائم ہے لیکن روشنی کی مدھم سی لکیر بھی اس اندھیرے میں چھید ڈالنے میں لگی ہوئی ہے لیکن اندھیرے اور اُجالے کی آپس کی کشمکش نے اس چھوٹی سوئی عورت کو ذہن کی کچھ ایسی حالت کر دی ہے کہ جب وہ نظریں اٹھا کر دیواروں کی جانب دیکھتی ہے تو

اسے ادھڑے ہوئے ایک حصے کی شبیہ کے عقب سے ایک خاردار جھاڑی نمودار ہوتی دکھائی دیتی ہے اور اس کی جڑوں میں ایک ایسا شخص گھات لگائے بیٹھا دکھتا ہے جس کے خدوخال اس کے اپنے دیس کی مہاراکشش سے ملتے ہیں جو اپنی پرجا میں تو مہابلی ہے لیکن اپنی گردن میں اس نے غلامی کا دھاری دار پٹہ پہن رکھا ہے، جب وہ ہیبت ناک شکل پورے وجود کے ساتھ ابھرتی ہے تو وہ چیخ اٹھتی ہے۔

نہیں...... میں نہیں دیکھنا چاہتی اُسے۔ خدا کے لیے اس کوٹھڑی کی چاروں دیواروں پر سے تمام سیمنٹ کھرچ کر انھیں ننگا کر دیجیے تا کہ آئندہ کسی بھی وقت یہاں سے اس کی گھناؤنی صورت کبھی نمودار نہ ہو سکے۔

اس کے لب پھر سے ایک دوسرے کے ساتھ چپک جاتے ہیں۔ وہ پھر سے بوڑھے سے بے دھیان ہو کر مشرقی کونے میں اپنی نگاہوں کا مرکز بنا لیتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں جیسے مایوسی اور سونے پن کا سیلاب سا اُمڈ آتا ہے۔

اس کوٹھڑی کی حدود سے باہر ایک کالے ناگ کی طرح پسری ہوئی سڑک ہے۔ اس پر اتنی رات گئے بھی لمبی لمبی گاڑیاں دندناتی پھر رہی ہیں۔ ان کے بند سیاہ شیشوں کو دیکھ کر ایسے لگ رہا ہے جیسے یہ کسی خاص مشن کے تحت یہاں گھوم رہی ہوں۔

آسمان پر چاند اب بھی بادلوں کی اوٹ میں اپنی ٹمٹماہٹوں کو سمیٹ کر چھپا ہوا ہے۔

”کیا واقعی تمھارا تعلق ان سے نہیں جنھوں نے۔“

ابھی بوڑھا قانون دان اپنی بات پوری نہیں کر پاتا کہ گوشت سے عاری ایک کمزور سا ہاتھ اس کی جانب اُٹھتا ہے۔ اس کی شہادت کی انگلی یوں ہلتی ہے جیسے کہہ رہی ہے۔

”چلے جاؤ یہاں سے۔ میری ذات کے گرد جھوٹی تسلیوں کے جال مت بنو۔“

اس کے ہونٹ اب بھی سلے ہوئے ہیں۔

وہ بوڑھا اس خاموشی سے کوئی نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کاغذ پر چند آڑی ترچھی لکیریں کھینچتا ہے اس سے ایک ایسا نقشہ وجود میں آتا ہے جسے سمجھنا ہر کسی کے بس میں نہیں۔ وہ اس نقشہ کو کچھ دیر کے لیے بغور دیکھتا ہے پھر لبوں پر ایک بھیانک مسکراہٹ بکھیر کر دوسرا سوال داغ دیتا ہے۔

”اوپر والے کہتے ہیں کہ تمھارے مختصر سے وجود کے اندر جو آتش فشاں وسعتیں ہیں وہ انھیں اپنے سلگتے دائروں میں مقید کرنے کی سعی میں ہیں...... سچ سچ بتائیں کیا یہ آپ کے اندر ہیں؟ کیونکہ سچ کو جاننا میرے لیے انتہائی ضروری ہے۔ آپ کو بچانے کے لیے۔“

بوڑھے قانون دان کا سوال سن کر اس منحنی سی خاتون کے بند لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیلتی ہے جو اس کے اندر کی تمام کڑواہٹوں کو باہر تک لے آتی ہے، جسے دیکھ کر بوڑھا کچھ دیر کے لیے خاموشی اختیار کر لیتا ہے۔

رات مزید گہری ہو جاتی ہے۔ بادلوں کی وجہ سے چاند اب بھی اپنی کرنوں کو دھرتی کو وسیع چادر میں ٹانکنے سے قاصر ہے۔

وہ لاغر اور منحنی سا جسم اب بری طرح ٹوٹ چکا ہے۔

اسے توڑنے اور بکھیرنے والے وہ سڑانڈ سے بھرے الفاظ ہیں جو سوالات کے صورت آئے دن اس کی سماعتوں میں انڈیلے جا رہے ہیں۔

وہ تو نیم مردہ جسموں میں زندگی کی روح پھونکنے والی ہے۔ وہ کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک زندگی دینے والی کو اس کو دو سنگین ہاتھ لالچ کے کاسے میں ڈال یوں سفید محل کی اس تنگ و تاریک کوٹھڑی کے حوالے کر سکتے ہیں۔

وہ اب تھک چکی ہے۔ اس کے تمام اعضا چکنا چور ہو چکے ہیں۔ اس کی آنکھوں کی پتلیوں پر کبھی کبھی ٹھہراؤ کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ اب بھی مشرقی کونے کی اور دیکھتی ہے۔ بار بار کے سوالات کے کوڑوں کو سہنے کی اب اس میں سکت نہیں ہے لیکن بوڑھا محافظ ایک مشینی انسان کی طرح ایک بار پھر کہہ اٹھتا ہے۔

"پہلے سوال کا جواب ابھی آپ کی جانب سے آنا باقی ہے۔ چلیں رہنے دیں۔ اسے پھر کبھی وصول کر لوں گا۔ اچھا! یہ بتایئے۔ کیا آپ کی طرف سے انگاروں کی بوچھاڑ آتی تھی...... اگر آتی تھی تو کیا وہ دائیں گئی یا بائیں۔ یا پھر سیدھی ان کی جانب۔ سچ ہی سے آپ کا بچاؤ ہو سکتا ہے۔"

وہ پھر تیزی سے اپنا سر بلند کرتی ہے۔ اس کے ہلدی جیسے چہرے پر سرخ لکیروں کا جال سا ابھر آتا ہے۔ اس کی آنکھیں آخری حد تک وا ہو جاتی ہے۔ جب وہ اپنا رُخ سمت موڑتی ہے تو اس بوڑھے قانون دان کو دیکھ کر اس کا پارہ چڑھ جاتا ہے۔ وہ اسی کیفیت میں اپنے لب کھولتی ہے اور بغیر کچھ کہے سنے اس کے منہ پر تھوک دیتی ہے۔

لب پھر بند ہو جاتے ہیں۔ وہ پھر سے مشرقی کونے میں اپنی نظریں مرتکز کر دیتی ہے۔

بوڑھے قانون دان کا چہرہ کسی بھی ردعمل سے عاری دکھائی دیتا ہے۔ وہ کچھ دیر کے لیے خاموشی کے ٹھہراؤ میں رہنے کے بعد خالی کاغذوں کے پلندے سے اپنا منہ صاف کرتا اور آڑھی ترچھی لکیروں سے اَٹے صفحات کو سمیٹ کر وہاں سے اُٹھتا ہے اور یہ کہتا ہوا کوٹھڑی کو چھوڑ کر باہر نکل جاتا ہے۔

"اس وقت تم غصے میں ہو۔ کوئی بات نہیں۔ تم شانت رہنا۔ تمھارے لیے سب اچھا ہی ہوگا۔ میں کل پھر آؤں گا چند مزید سوالات کے ساتھ۔ میرا تمھارے بطون میں اترنا نہایت ضروری ہے۔"

وہ اس اندھیر نگری کی کوٹھڑی میں بوڑھے کے ہوتے ہوئے بھی تنہا تھی اور اب بھی ہے۔ اس کی موجودگی میں بھی یہاں سناٹا تھا، اب بھی ہے۔ اس سے پیشتر اس کی نگاہوں کا مرکز مشرقی کونا تھا۔ اب بھی ہے کوٹھڑی سے باہر فلک کی پہنائیوں میں روشنیوں کے منبعے اب بھی بادلوں کے قبضے میں ہیں اور دھرتی میں اب بھی ان کی تمازتوں کو ترس رہی ہے۔ فرق اگر کچھ پڑا ہے تو اس کی آنکھوں کے سوکھے پن میں پڑا ہے اب ان میں جو دو موٹے موٹے آنسو جھلملا رہے ہیں وہ اس کوٹھڑی کے پختہ فرش پر گر کر ٹوٹنے سے پہلے اپنی مغموم ماں کے مرجھائے ہوئے رخساروں میں جذب ہونا چاہ رہے ہیں تاکہ وہ زندگی کے آخری لمحوں تک آنے والے کل کو قانون دان کے پیروں تلے خود کو روندے جانے سے بچا سکیں۔

☆☆☆☆☆

جوڑی

تسنیم کوثر

دور تک سوکھے پتے پھیلے ہوئے تھے۔
خزاں رسیدہ۔ زرد زرد پتے بے گھری کے درد سے بے حال۔
شاخوں کی جُدائی کے غم سے نڈھال۔
ہوا کے تیز جھونکے اِن پتوں کو اِدھر اُدھر اڑاتے پھر رہے تھے اور وہ جھولی میں کتاب رکھے جانے کب سے ہوا اور پتوں کی یہ آنکھ مچولی دیکھ رہی تھی۔
خزاں کا یہ زرد موسم اُسے ہمیشہ سے ہی بہت سحر انگیز لگتا تھا۔ عجیب دیوانگی سی طاری کر دیتا تھا۔
ان چُرمُر سوکھے پتوں پہ چلنا اور ..... موسیٰ سے باتیں کرنا اُسے بہت اچھا لگتا تھا۔
جوں جوں شام کے سائے گہرے ہوتے جاتے ..... یہ ٹنڈ منڈ درخت اور ہوا سے اُڑتے خشک پتے ثمر کے دل میں ہلچل مچا دیتے۔
تمھیں خزاں سے اتنا عشق کیوں ہے؟
موسیٰ اکثر اُس سے یہ سوال کرتا تھا اور ثمر اُس کے جواب میں بس نظر بھر کے موسیٰ کو دیکھتی اور مسکرا دیتی کہ .....
اُس کے پاس اِس سوال کا کوئی جواب تھا ہی نہیں کیونکہ عشق میں ''کیوں'' کا لفظ نہیں ہے۔ عشق کسی وجہ سے نہیں ہوتا یہ تو بس ..... ہو جاتا ہے۔ لاکھ دلیلیں .....

تاویلیں عشق کی راہ میں آئیں ...... یہ کسی کی نہیں سنتا۔ بس سرکش گھوڑے کی طرح سرپٹ دوڑتا جاتا ہے۔ من مانیاں کرتا رہتا ہے۔
موسیٰ بھی تو اُس کا عشق تھا اور یہ عشق ...... کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت نہیں ہوا تھا۔
اوائل دسمبر کی پھیکی پھیکی دھوپ میں وہ برآمدے میں بچھے تخت پہ کتابیں پھیلائے بیٹھی تھی ...... فائنل امتحان قریب آ گئے تھے اور وہ ہمیشہ کی طرح نالائق بچوں کی مانند صرف پاس ہونے کی تگ و دو میں مصروف تھی کہ اچانک ...... ایک گیند اُچھلتی ہوئی آئی اور قریب پڑے پانی کے بھرے ٹب میں جا گری ...... پانی اچھلا اور شدید سردی میں یخ بستہ پانی کے چھینٹے ثمر کو بھگو گئے۔
ثمر تلملا کے رہ گئی۔
پانی ٹھنڈا تھا مگر ...... ثمر کا مزاج گرم کر گیا تھا۔
کون ہے یہ بدتمیز؟ وہ دھاڑی
گلی میں سناٹا تھا شاید ...... زنانہ مولا جٹ کی آواز نے کھلاڑیوں کو خوفزدہ کر کے بھاگنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ اس نے تخت پہ پنجوں کے بل کھڑے ہو کر باہر جھانکنے کی کوشش کی مگر ...... ناکام رہی۔
اونہہ! گلی نہ ہوئی کرکٹ کا میدان ہو گیا ...... جسے دیکھو عمران خان بننے کی کوششوں میں ہے۔ وہ بڑبڑانے لگی تھی کہ ...... گیٹ پہ زوردار دھڑ دھڑاہٹ نے اسے مزید غصہ دلا دیا۔
اُس نے تیزی سے گیٹ کھولا ...... قہر آلود آنکھوں سے دستک دینے والے کو دیکھا۔
محلے کے بچوں کی ٹیم کے ساتھ ایک خوبرو جوان بلا تھامے کھڑا تھا۔
ثمر نے غصے سے گیٹ بند کرنا چاہا مگر ...... وہ نوجوان دایاں پاؤں گیٹ کے اندر اڑا چکا تھا۔
کیا بدتمیزی ہے؟ وہ جھنجھلائی۔
گیند بھلے مت واپس کیجیے مگر ...... ان بہت سے بندھے ہوئے ہاتھوں کی لاج رکھ لیجیے۔ ثمر نے دیکھا کہ وہ اور اس کی پوری ٹیم ...... ہاتھ باندھے معافی کی طلبگار تھی۔
ثمر کی ہنسی نکل گئی۔ اُس کی پیار بھری ہٹ دھری دیکھ کے ثمر نے گیند اچھال دی۔
وہ کون تھا؟ اسے کچھ خبر نہ تھی۔
خبر تھی تو اتنی کہ ...... گیند اُس کی طرف اچھالتے ہوئے ثمر نے اپنا دل بھی اُچھال دیا تھا اور موسیٰ ...... گیند کے ساتھ ساتھ ثمر کے دل کی دولت لیے وہاں سے واپس پلٹا تھا۔
یہی اُس کا عشق تھا اور یہی عشق کی معراج۔
وہ اور موسیٰ خوش تھے۔ اپنے گھر کو جنت بنائے ہوئے تھے۔ لیکن اس خوبصورت سنگت اور اس محبت میں بھی خزاں سے ثمر کا عشق کم نہیں ہوا تھا۔
اور اب ......
جب موسیٰ کا ہاتھ اور ساتھ چھوٹے برسوں

بیت گئے تھے اُسے لگ رہا تھا جیسے خزاں کا
موسم ......اُس کی ذات میں ٹھہر سا گیا ہے۔
کتنی عجیب بات تھی۔ اسے یہ موسم تب بھی
اچھا لگتا تھا جب...... زندگی دکھوں سے آشنا
نہیں تھی اور یہ موسم اب بھی اُسے اپنے سحر
میں لیے ہوئے تھا جب زندگی...... دُکھوں
کی پھوار میں بھیگ رہی تھی۔
مانا یہ دکھ سنگین نوعیت کے نہیں تھے مگر......
دُکھ تو دُکھ ہوتے ہیں اچھے بھلے آدمی کو کھا
جاتے ہیں۔ جلا ڈالتے ہیں۔ وہ بھی دُکھوں
کی آگ میں سُلگ رہی تھی اور یہ آگ......
کسی اور نے نہیں اس کے اپنوں نے
سلگا رکھی تھی۔
نفرت، حسد، تنہائی کی اس آگ نے سب
کچھ بھسم کر ڈالا تھا۔
گھر میں یوں تو وہ تین تھے مگر...... ان تینوں
کے درمیان گویا صدیوں کے فاصلے حائل
تھے...... موسیٰ اور ثمر نے مل کر جس گھر کو
جنت بنایا تھا۔ سرد مہری کی آگ نے اُسے
جہنم بنا رکھا تھا۔
اُسے یاد آیا۔
شادی کے بعد جب وہ ہنی مون منانے شمالی
علاقہ جات گئے تو وہاں...... خوبصورت
گلابی چہروں والے گول مٹول سے بچوں کو
دیکھ کر موسیٰ نے اسے کہا تھا۔
دیکھو ثمو! مجھے تم سے کچھ نہیں چاہیے بس دو
بچے چاہئیں...... ایسے ہی موٹے موٹے
گپلو سے دو بیٹے!
اور وہ جو...... ابھی دس دن کی تو بیاہتا دلہن
تھی موسیٰ کی اس فرمائش...... پر شرما کے
موسیٰ سے لپٹ گئی تھی اور اُس کے سینے سے
لگی وہ...... موسیٰ کی یہ مراد پوری ہونے کی
دعائیں مانگ رہی تھی۔
رب نے اُس کی دُعا سُن لی تھی۔
موٹا تازہ گپلو گپلو عون اُن کی زندگی میں
آ گیا تھا۔
وہ اور موسیٰ اپنی پہلی اولاد کے نشے میں
سرشار تھے۔ اُسے دیکھ دیکھ جیتے تھے۔ اس
کی ایک ایک حرکت پہ لطف اندوز ہوتے
تھے اور عون روز بروز خوبصورت ہوتا جا رہا
تھا اب تو وہ سکول جانے لگا تھا مگر......
موسیٰ کچھ مُضطرب سا تھا...... وہ اپنے کنبے
کو ادھورا سمجھ رہا تھا۔ اُس کے جی میں ایک
اور بیٹے کی تمنا سر اُٹھانے لگی تھی۔
شاید یہ اُس کے اندر کی محرومی تھی جو ہر
پل...... اس کو ڈراتی رہتی تھی۔
موسیٰ کے خاندان میں کئی نسلوں سے اکلوتا
پن چلا آ رہا تھا۔ اُس کے دادا اپنے
والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ اُس کے ابا
کا بھی کوئی بھائی نہ تھا اور اب موسیٰ بھی
اکلوتا تھا۔ سات بہنوں کا اکلوتا بھائی......
دوسرے بیٹے کی خواہش میں بیٹیوں کا
ڈھیر لگ گیا تھا۔ ابا کچھ مایوس سے ہو گئے
تھے اُن کی جوڑی مکمل نہ ہو سکی تھی۔ جانے

کیوں اس کے ذہن میں ہر وقت ابا کا یہ فقرہ گونجتا رہتا تھا۔

''کلاتے رُکھوی نہ ہووے''

موسیٰ کو یہ محرومی کھلنے لگی تھی۔ وہ ثمر کو لیے مزاروں، درباروں پہ جانے لگا تھا۔ ایلوپیتھک، ہومیو پیتھک علاج کروا رہا تھا۔ ثمر کٹھ پتلی بنی اس کی یہ خواہش پوری ہونے کی دعائیں مانگ رہی تھی اور پھر.....

بڑی منتوں مُرادوں کے بعد عوف اُن کی زندگی میں آ گیا۔ ثمر بہت خوش تھی موسیٰ کی خوشی قابل دید تھی۔ اُس کی خواہش پوری ہو گئی تھی۔ اللہ نے جوڑی ملا دی تھی مگر.....

عون خوش نہیں تھا۔

اُسے چھوٹا منا اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ ثمر کو اُس کے پاس جانے ہی نہیں دیتا تھا۔ بہت مشکلوں سے موسیٰ اور ثمر نے عون کو سنبھالا تھا۔ چھوٹے سے زیادہ اسے وقت دینا شروع کر دیا تھا۔ عون نے مجبوراً نئے مہمان کو قبول کر لیا تھا مگر..... اس کے باوجود وہ بھائی کے قریب نہیں جاتا تھا۔

وقت گزر رہا تھا۔ بچے بڑے ہوتے جا رہے تھے مگر..... ساتھ ساتھ ان کے درمیان فاصلے بھی بڑھتے جا رہے تھے

دونوں ایک دوسرے سے گھلتے ملتے ہی نہ تھے۔

دونوں کا فرق تو تھا ہی مگر..... دلوں میں بھی فرق آ گیا تھا۔ نفرت ایک خودرو پودے کی طرح بڑھتی جا رہی تھی۔ دونوں ایک دوجے سے یوں پرے پرے رہنے لگے تھے جیسے..... اچھوت ہوں۔ ایک کی موجودگی میں دوسرا ماں کے پاس آنے سے گریز کرتا تھا..... وہ دونوں کو قریب لانے کی کوشش کرتی مگر..... ناکام رہتی۔

وہ اندر ہی اندر گھٹتی رہتی۔

جب موسیٰ حیات تھا تو ثمر کو بچوں کی یہ نفرت اتنی نہیں کھلتی تھی..... مگر جب سے وہ اکیلی ہوئی تھی..... ہر وقت گیلی لکڑی کی طرح سلگنے لگی تھی۔

یہ ایسا دکھ تھا۔

جس کا اظہار وہ کسی سے کیا کرتی؟

کسی سے کیا کہتی؟

دونوں بچے اُس کے فرمانبردار تھے۔ ماں کو ہتھیلی کا چھالا بنا کے رکھے ہوئے تھے۔ اس کا خیال رکھتے تھے۔ اس کی ہر بات مانتے تھے سوائے اس بات کے..... کہ دونوں بھائی ایک دوجے سے پیار کریں ایک دوسرے سے گھلیں ملیں۔ ماں کی یہ بات انھیں گوارا نہیں تھی۔

اب تو اس نے کہنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

وہ سوچ رہی تھی!

موسیٰ نے جانے میں بہت جلدی کی۔ کتنا شوق تھا اُسے جوڑی مکمل کرنے کا وہ ہوتا تو دیکھتا کہ.....

اُس کی جوڑی مکمل ہوتے ہوئے بھی مکمل نہیں تھی۔

☆☆☆☆☆

ہری گچھی

کلیم خارجی

ہری جنگلی بوٹیوں کی گچھیاں اپنی تھیلی میں ڈال کر جب وہ کنویں کے پاس سے گزرا تو کنویں کے پاس کھلے مندر کے برآمدے سے چیختا ہوا مجاور باہر نکلا اور اُسے دھمکاتے ہوئے بولا کنویں کا ڈول چھونے سے پہلے۔ اپنا مذہب، مسلک اور شجرہ بتاؤ---- اگر تم ہم میں سے نہیں ہو تو کنویں کے پاس سے ہٹ جاؤ۔ تمہارا سایہ بھی پانی کے لیے منحوس ہے۔ وہ تھیلے میں سے ایک ہری گچھی نکال کر چباتے ہوئے بولا۔ میں نے کبھی وہ خوراک نہیں کھائی۔ جو تم اور تمہاری نسل کے سب لوگ کھاتے ہیں اور نہ ہی تمہارے کنویں کا پانی پیا ہے۔ میں وہی ہوں جو تم سمجھ رہے ہو۔ وہ دوسری گچھی نکال کر مزے سے کھانے لگا۔ وہ مجاور کے قریب آنے کا منتظر تھا مجاور جرأت اور غرور سے اُس کے پاس آ کر اُسے یوں گھورنے لگا۔ جیسے وہ اپنی آنکھوں کے اثر سے اُسے ہلاک کر ڈالے گا۔ مجاور چھوٹے قد کا سفید سا آدمی تھا۔ اُس کی آنکھیں ہلکے سبز رنگ کی تھیں اس کا سر چھوٹا، گردن پتلی لمبی اور دھڑ جسم کے مقابلے میں قدرے لمبا تھا۔ اُس کی ناک لمبی اور نتھنے پھیلے ہوئے تھے، جب وہ بولنے لگتا تو اُس کی ناک منہ میں اُترتی ہوئی نظر آتی۔ وہ مجاور کو دیکھ کر ذرا سا ہنسا۔ اُس

نے دل میں سوچا اگر یہ مجاور زمین پہ منہ کے بل لیٹا ہو تو بالکل چھپکلی کی طرح نظر آئے گا۔ مجاور کو تنہا دیکھ کر وہ رُک گیا۔ اُس کے اندر شرارت اُمڈ آئی۔ مجاور نفرت سے غراتے ہوئے بولا۔ کون اور کس لیے ہو؟ میں تمہارا سر پھوڑ کر تمہاری بلی چڑھانے کی طاقت رکھتا ہوں۔ کیونکہ جینے کا حق صرف ہمارا ہے۔ دھرتی، پانی اور اس پر اُگنے والی ہر چیز ہماری ہے۔ ہم اس دُنیا کے اصلی اور حقیقی وارث ہیں۔ وہ کچھی نکلتے ہوئے بولا، تمہارے سوال اصل میں تمہاری دھمکیاں ہیں۔ جن کا جواب تم سننا نہیں چاہو گے۔ میں تمہارے اناج، غذا اور پانی سے خود ہی ہاتھ کھینچ رکھا ہے۔ بڑی ریاضت اور جوکھوں سے میں نے یہ بوٹی زمین پہ ڈھونڈی ہے ابھی تک اس کا کوئی نام نہیں رکھا۔ اس میں رس بھی ہے اناج بھی ہے۔ اور یہ برسوں سے میری زندگی اور جسمانی طاقت کا باعث ہے۔ اس نے ہری کچھی مجاور کے منہ کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ تم، تمہارے راجہ اور دیوی دیوتا۔ اس بوٹی کو اُگنے سے نہیں روک سکتے تم لوگ اسے ڈھونڈ نہیں سکتے۔ یہ آسمانی طاقتوں نے صرف مجھ جیسے لوگوں کے لیے پیدا کی ہے۔ یہ صرف ہمارے لیے ہے۔ اسے کھا کر نہ ہم بیمار ہوتے نہ بوڑھے۔ ہم مرنے سے پہلے دریا میں اُتر جاتے ہیں۔ اور پانی ہمیں غائب کر دیتا ہے ـــ مجاور کو غصہ آ گیا وہ اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی کو لہراتے ہوئے بولا، تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تم پست اور کمینے ہو۔ زمین پر تمہارے لیے جو ذلت ہے اس کے باعث تمہارا دماغ سکڑتا جا رہا ہے۔ عنقریب تم کسی مکروہ جانور میں تبدیل ہونے والے ہو۔ اس نے آس پاس اچھی طرح دیکھا۔ مجاور کو کمزور اور اکیلا پا کر وہ دہشت ناک سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے بولا۔ تم اور تمہارے لوگ اس مندر میں جن دیوی دیوتاؤں کے دیے جلا کر ان کی پرستش کرتے ہو۔ وہ دراصل کمینی، پلید اور بدبودار بدروحیں ہیں۔ جبھی تم سب لوگوں کے اندر نفرت اور دشمنی کی آگ دہکتی رہتی ہے۔ تمہارے سرداروں، راجاؤں اور پجاریوں کے چہرے ہوس کی وجہ سے بگڑے ہوئے ہیں۔ تم سب کے ہاتھ کئی معصوم لوگوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ تم لوگ پرہیزگاری کا ڈھونگ رچا کر ہر گناہ کا لطف اُٹھاتے ہیں۔ دیکھ لینا تمہاری کنواریاں جل کر مریں گیں۔ تم اندھیرے، گناہ، جہالت اور ظلم کی پوجا کرنے والے لوگ ہو۔ تم جن دیوتاؤں کو پوجتے ہو وہ بدلے میں تم لوگوں کو چوہے اور چوہیاں بنا دیتے ہیں۔ جاؤ دیکھو۔ تمہارے مندر میں اندھیرا پھیل رہا ہے۔ مجاور نے مڑ کر مندر کی طرف دیکھا۔ اُسے واقعی دیے بجھے ہوئے محسوس ہوئے۔ وہ بھاگ کے اندر گیا۔ مندر میں تاریکی دیکھ کر وہ اتنا خوفزدہ

ہوا کہ وہ پاگلوں کی طرح چیختا ہوا باہر آیا مندر کے پچھلے حصے میں سوئے ہوئے موٹے موٹے خدمت گار ہراساں ہو کر باہر آ کر اُسے سنبھالنے لگے۔ وہ چیختے ہوئے بولا - وہ شخص ہمارے دیوی دیوتاؤں اور پجاریوں کی تذلیل کر رہا تھا اُس کی باتوں کی وجہ سے مندر میں جلتے ہوئے سارے دیے بجھ گئے - اسے پکڑو اُس کی بلی چڑھائیں۔ ورنہ بہت بڑا عذاب نازل ہو سکتا ہے۔ غصے اور غم سے وہ بھی اِدھر اُدھر دوڑ کر اُسے ڈھونڈنے لگا۔ لیکن ہری پچھی کو کھانے والا ایک دم سے کہیں غائب ہو چکا تھا۔ ناکام اور تھک کر مجاور پہ اچانک غشی طاری ہو گئی۔ اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

شام کو کھلے مندر کے صحن میں بہت بڑا مجمع اکٹھا ہو گیا۔ مجاور اب ہوش میں آ چکا تھا شہر کے اہلکار، پیشوا اور جان نثاروں کے ایک ہجوم دیکھ کر وہ ایک میز پر چڑھ کر جذبات میں روتے ہوئے بولا - میں یہاں کئی برسوں سے برگزیدہ لوگوں کی چند قبروں اور اس مندر کی خدمت پر مامور ہوں - میں دیوی دیوتاؤں کا منتخب کردہ مجاور ہوں - میری زندگی میں اتنی بڑی توہین میرے سامنے ہو گئی۔ اور میں بے بس رہا۔ میں اس کی بلی چڑھانے کی خواہش میں تڑپ رہا ہوں - میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر وہ نہ مل پایا۔ تو میں خود کو جلا کر اپنی قربانی دے کر دیوی دیوتاؤں کو راضی کروں گا - آنسو پونچھتے ہوئے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ وہ ہری بوٹیوں کی پچھیاں چبا رہا تھا۔ اس نے ہمارے دانے پانی کا مذاق اُڑایا۔ اُس نے ہمارے عزت داروں کو مکار، بدکار اور خونی کہا۔ اس نے ہماری دیوی دیوتاؤں کو پلید اور غلیظ بدروحیں کہا۔ بس اس کا یہ کہنا تھا کہ مندر کے اندر جلتے ہوئے سارے دیے بجھ گئے - میں اُسے ہلاک کرنے کے لیے باہر آیا۔ تو وہ غائب ہو گیا۔ میں سکون سے خالی ہوں میں جلد ہی اپنے آپ کو آگ لگا کر اس توہین کا بدلہ لوں گا۔ اُس نے اپنا سینہ پیٹنا شروع کیا تو شہر کا میر اُٹھا اُس نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ہم اتنے کمزور اور بے بس نہیں سب جانتے ہیں۔ دُنیا جانتی ہے کہ ہم اپنے دشمنوں کو کس طرح مارتے ہیں۔ ہم نے دریاؤں کے منہ موڑ دیئے ہیں۔ پہاڑوں پہ ہمارے جھنڈے لہرا رہے ہیں۔ ہم طاقتور لوگ ہیں ہمارے دیوتا اور تمام دیویاں عظیم، پاک اور طاقت کا سرچشمہ ہیں ہم عظیم لوگ اپنے دیوتاؤں کی پوجا کی وجہ سے عظیم ہیں۔ دشمن ہمیشہ بزدل اور خوفزدہ رہا۔ زمانہ ہماری فتوحات کے گواہ ہے کسی انسان کی یہ جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ ہمارے غم و غصے کا باعث بنے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ کوئی صدیوں پرانا چوپایہ ہو گا - جو انسان کے روپ میں اچانک نمودار ہوا ہے۔ لیکن ہم اُسے ڈھونڈ نکالیں گے - ہم

اُسے اپنی مرضی کی اذیت ناک موت کی سزا دیں گے۔ میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ اس عظیم اور معصوم مجاور کو یہاں سے اُٹھا کر شہر کے چوک میں بٹھا دیا جائے اور ہر وہ شخص جو اجنبی ہو اس کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ یہ اُسے پہچان سکے وہ اسی زمین پہ ہی ہوگا۔ کب تک چھپتا پھرے گا مجاور نے یہ بھی کہا کہ وہ ہمارے دانہ پانی، اناج پھل اور اچھے کھانوں کو منہ نہیں لگاتا۔ اس لیے اگر کوئی ایسا شخص نظر آئے۔ جو ہم جیسی غذائیں نہ کھاتا ہو اُسے بھی پکڑ کر مجاور کے سامنے لایا جائے مجھے یقین ہے چند دنوں میں یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔

اگلی صبح لوگوں کا ایک ہجوم شہر کے میئر اور عزت داروں کی رہنمائی میں مجاور کو لے کر شہر کے سب سے بڑے چوک پہ نمودار ہوا۔ چوک پہ پہلے ہی سے لکڑی ایک بہت بڑا چبوترا رکھ دیا گیا تھا۔ جس پہ سرخ رنگ کا قالین دھوپ میں لہک رہا تھا میئر کی طرف سے چبوترے کے پیچھے دو سپاہی بھی ہتھیاروں سے لیس کھڑے کر دیے گئے تھے۔ شہر کے میئر نے مجاور کا ہاتھ پکڑ کر اُسے چبوترے پہ چڑھا کر۔ محبت اور شفقت سے اس کا ہاتھ تھپتھپا کر اُسے بیٹھ جانے کے لیے کہا۔ حاکم کے دیکھا دیکھی۔ بہت سے لوگوں نے عقیدت سے اس کے ہاتھوں اور پیروں کو چھوا۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد ہی مجاور کے چبوترے کے سامنے اجنبی لوگوں کی شناخت پریڈ شروع ہوئی۔ شناخت کے لیے آنے والے ہر شخص احترام سے اس کے آگے کھڑا ہو جاتا اور پھر اس کے پاؤں چھونے لگتا۔ مجاور اس کے چہرے کو غور سے دیکھتا۔ اور آگے بڑھ جانے کا اشارہ کرتا۔ اس دوران کئی لوگوں نے خوف اور دہشت کی وجہ سے شناخت کے بعد مجاور کے پیروں میں نذرانے رکھنا شروع کر دیے۔ شام تک مجاور کے پیچھے قیمتی کپڑوں، برتنوں، پھولوں اور اناج کی تھیلیوں کا ڈھیر لگ گیا۔

اس کے پیروں کے درمیان سونے اور چاندی کی الگ ڈھیریاں بھی نمایاں نظر آ رہی تھیں۔ اندھیرا پھیلا تو مجاور نے دو بیل گاڑیاں منگوائیں اور بھینٹ میں ملی ہوئی ساری چیزیں لاد کر اپنے گھر روانہ ہو گیا۔ کئی دن تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ شہر کے حاکم کو اس سارے ماجرے کا علم ہوا تو اس نے سب سے پہلے مجاور کے محافظ سپاہی واپس بلوا لیے پھر اس کے بعد اس نے نذر نیاز کی ساری چیزوں کو اپنے حویلی میں لانے کا حکم دیدیا۔ اس نے یہ حکم بھی جاری کیا کہ چبوترے سے اُٹھتے ہی ساری چیزیں اپنی نگرانی میں اُس کے خادموں کو حوالے کرے گا۔ اور حاکم اپنی مرضی سے اس کا معاوضہ طے کرے گا۔ مجاور کو حاکم یہ بات بہت بُری لگی۔ لیکن پھر بھی وہ خوش تھا کہ دن بھر تازہ اور مزے دار غذاؤں کی صورت میں اُسے جو کچھ ملتا ہے حاکم اس میں حصہ دار

نہیں بن سکتا۔ آہستہ آہستہ چبوترے کے سامنے سے لوگوں کا ہجوم چھٹنے لگا شناخت کے لیے حاضر ہونے والے بھی دن میں تین چار مرتبہ ہی اس کے سامنے پیش ہوتے۔ نذرانے ملنے بھی کم ہونے لگے۔ تو حاکم نے شہر میں اعلان کروایا۔ کہ مجاور کو پیش کیے جانے والے نذرانوں سے دیوی دیوتاؤں کو خوشی ملتی ہے اور شہر کے محافظوں کے پاس نئے ہتھیار آنے لگے ہیں۔ مندر بچ جاتے ہیں اور زمین کی زرخیزی میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ اس لیے لوگوں کو نذرانے دینے کا سلسلہ بند نہیں کرنا چاہیے ورنہ چھپا ہوا شخص ہاتھ نہیں لگے گا حاکم کے اعلان کا بے حد اثر ہوا۔ لوگ مندروں میں جانے کے بجائے دوبارہ مجاور کے قدموں میں نذرانے رکھنا شروع کردیئے۔ مجاور جسمانی اور روحانی طور پہ چبوترے پہ بیٹھ کر نذرانوں کا عادی ہو چکا تھا۔ اس کا رنگ سرخ سفید ہو چکا تھا۔ اس کا لمبوترا چہرہ گول اور اتنا موٹا ہو چکا تھا کہ اس کی آنکھیں گالوں کے پھولے ہوئے گوشت میں چھپ گئیں تھیں۔ اب وہ گیند بن کر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا رہتا گرمیوں اور بارشوں میں اس کے لیے رنگ برنگی خوبصورت اور بڑی سی چھتری کا اہتمام کردیا جاتا اور چبوترے کے نیچے بڑے بڑے مٹکوں میں شربت بھرا رہتا۔

سردیوں کی چمکتی دھوپ میں مجاور سفید اجلے کپڑوں میں مالاؤں کے بوجھ تلے اونگھ رہا تھا کہ کسی نے اس کے پاؤں چھو کر اُسے جگایا مجاور نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے اُسے گھورا۔ اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ چھونے والے نے کہا میں تمہیں کئی ہفتوں سے دیکھ رہا ہوں۔ کہ تمہاری بینائی ختم ہو چکی ہے تم صرف دیکھنے کا ڈھونگ رچا رہے ہو۔ تمہارے اندر کی نفرت اور ہوس دھواں بن کر تمہاری بینائی کو نگل گئی ہے۔ مجاور نے گرجتے ہوئے بولا۔ کون ہو بھائی --- یہ کس لہجے میں بول رہے ہو---

تم شاید اپنے نئے دھندے اور نذرانوں کی لالچ میں مجھے بھول گئے ہو۔ لیکن میں تمہارے لیے یہ ہری بوٹیوں کی پچھی لایا ہوں۔ اسے کھالو تاکہ تمہاری بینائی لوٹ آئے۔ اور تم مجھے پہچان سکو۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ایک چھوٹی سی پچھی مجاور کے منہ میں ٹھونس دی مجاور کو پچھی کا ذائقہ اچھا لگا اور وہ بھوکے بیل کی طرف منہ ہلاتے ہوئے رازداری سے بولا تم کھڑے ہو کہ -- چلے گئے ہو--- کوئی جواب نہ پا کر اُس نے چیخنے کی کوشش لیکن وہ جھٹکے سے پیچھے کی طرف لڑھک گیا۔ اس کے ادھ کھلے منہ سے سفید جھاگ باہر نکلنے لگا ہری پچھی کی چند شاخیں اس کے منہ میں ٹھونسی ہوئی نظر آرہی تھی لیکن وہ بے جان ہو چکا تھا۔

☆☆☆☆☆

متاع الغُرور

بہت خوش نظر آ رہی ہو سکینہ بہن؟

فردوس نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے مسکرا کر کہا تو سکینہ کے چہرے پر سرشاری کی کرنیں دمکنے لگی تھیں۔ اندرونی خوشی عیاں ہو رہی تھی۔

ہاں، بہت ہی زیادہ خوش ہوں۔ سکینہ نے بھی مسرّت سے بھرپور اظہار کیا۔ خوش کیوں نہ ہوتی آج۔ برسوں کی محنت رنگ لائی تھی۔ اس نے اپنے اکلوتے بیٹے جواد کو اپنا پیٹ کاٹ کر اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ جواد نے بھی ماں کو مایوس نہ کیا تھا۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ کہیں نہ کہیں کوئی نوکری، ٹیوشنز وغیرہ پڑھاتا رہا۔ اس کا صلہ اسے اعلیٰ نوکری کی صورت میں ملا تھا۔

اللہ تمھیں اور زیادہ خوشیاں دے۔ سکھ والی زندگی دے۔ فردوس اس کی نہ صرف ہمسائی تھی بلکہ اچھے بُرے دنوں کی ساتھی تھی۔ سہیلی تھی، ہمراز تھی، اسے بھی سکینہ کی خوش دل سے عزیز تھی۔

سکینہ پہ اس وقت بیوگی کی چادر تن گئی جب جواد آٹھ سال کا تھا۔ جواد کے بعد اس کی بہن حوریہ پیدا ہوئی، مگر ایک ماہ بعد ہی فوت ہوگئی۔ کلیم ایک دکان پہ سیلز مین تھا۔ شکر کہ اڑھائی مرلے کا مکان اپنا تھا۔ کلیم کی تنخواہ سے گھر کی روٹی چل رہی تھی، مگر اس کی وفات کے بعد سکینہ پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ وہ بوکھلا گئی۔ دماغ سُن تھا، دوچار رشتہ دار تھے۔ محلے دار تھے۔ ''مصیبت میں سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے'' کے مصداق سبھی رفتہ رفتہ دور ہونے لگے۔ کون کب تک ساتھ دیتا؟ کئی روز وہ اسی کیفیت سے دوچار رہی، سلائی وہ پہلے بھی کرتی تھی، سو اب اسے مستقل ذریعہ معاش بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے سامنے موجودہ حالات اور جواد کا مستقبل تھا۔ اس موقع پر سکینہ کا فردوس نے بھرپور ساتھ دیا، اس کے لیے کام ڈھونڈ، ڈھونڈ کر لاتی، تاکہ سکینہ عزت کی زندگی گزار سکے۔ سکینہ کسی کے گھر لحاف لینے چلی جاتی۔ کبھی چادروں کی سلائی کرتی اور اس کے ہاتھ میں نفاست وصفائی تھی۔ بازار سے بوتیک والوں سے رابطہ کیا، یوں مزید کام آنے لگا۔ شام میں بچوں کو قرآن پاک پڑھاتی۔ اس طرح کافی گھروں سے اس کی جان پہچان ہوگئی۔

فصیحہ آصف خان

زندگی کی گاڑی رواں دواں تھی۔ دن رات محنت کرکے، روکھی سوکھی کھا کر اس نے حلال کا لقمہ کھایا اور جواد کو کھلایا، کہ اسے بیٹے کو افسر بنانا تھا۔ اپنی محنت کا پھل کھانا تھا۔

جواد بھی ماں کی محنت کی دل سے قدر کرتا تھا۔ اپنی پڑھائی، رات گئے ٹیوشنز کے بعد وہ رات کو ماں کے پیر دبائے بغیر نہ سوتا تھا۔ ماں کے ہاتھوں کو بوسہ دیتا، اسے نئی خوشگوار امیدیں دلاتا۔ خوشحالی اور سکون کے دنوں کی نوید سناتا، سکینہ کے اندر سے تھکن جیسے پل بھر میں ہی ختم ہو جاتی تھی۔ آنے والے مسحور کن دنوں کے تصور اس کی دکھتی رگوں اور جوڑوں پر مرہم کا کام کرتے اس کا فرمانبردار، لائق بیٹا۔

احساس کرنے والا شاید ہی جواد جیسا کوئی اور ہو، سکینہ کا رواں رواں اسے دعائیں دیتا۔ محنت مزدوری کا صلہ آج اسے مل گیا تھا۔ جواد کی نوکری نے اس کے سارے ولدر دور کر دیے تھے۔ رات دونوں ماں، بیٹا نے ایک دوسرے کو مٹھائی کھلائی۔

خوشیوں کے سارے موسم اسے چھونے سے آنگن میں رقص کرنے لگے تھے

....

جواد جیسے خوبرو اور تعلیم یافتہ انسان کو دیکھ کر دفتر والے بھی رشک کرنے لگے۔ پہلی تنخواہ ملتے ہی جواد نے ماں کو آرام سے بٹھا دیا۔

اب آپ صرف کھانا پکائیں گی۔ کیونکہ جو ذائقہ آپ کے ہاتھ میں ہے وہ کسی میں نہیں۔ باقی تمام کام کرنے والی ایک خاتون آئے گی، آپ نے صرف حکم چلانا ہے۔

جواد نے حسب عادت ماں کے ہاتھوں پر بوسہ دیتے ہوئے کہا تو سکینہ اطمینان کی لہریں اپنے اندر اٹھتے ہوئے محسوس کرنے لگی۔

گھر کی ضروری مرمت کروانے کے ساتھ کئی نئی چیزیں آرائش کے لیے لے آیا۔ بس بیٹا اب میں تمھاری شادی کے لیے جوڑ توڑ کروں گی، بہت اچھی سی لڑکی ڈھونڈنی ہے مجھے۔ سکینہ بیٹے کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے بولی۔

تو جواد بھی مسکرا دیا۔ کہ نوکری، بنیادی ضرورت کی ہر چیز میسر تھی، کمی تھی تو اک مخلص ہمسفر کی۔ جو رات کی تنہائی میں اسے اور زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ سکینہ نے فردوس کے ساتھ ملکر لڑکیاں دیکھنے کا ارادہ کر لیا۔ آخر کبھی نہ کبھی تو گوہر مقصود مل جائے گا۔

جواد نے سامنے بیٹھے صغیر صاحب کو حیرت سے دیکھا۔ پھر اس فائل کو جو اس کے سامنے میز پر رکھی تھی۔

جواد صاحب اس میں آپ کا ہی فائدہ ہے۔

صغیر صاحب کے لہجے میں عجب پراسراریت تھی۔ جواد کو نوکری کرتے آٹھ ماہ ہو گئے تھے، اور آج پہلی بار اسے ایک غیر قانونی کام کرنے پر اکسایا جا رہا تھا۔

آپ نے محض چند دستخط ہی کرنے ہیں اور ہزاروں کا فائدہ۔

صغیر صاحب اسے لالچ دیتے ہوئے اس کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔

تب جواد فوراً اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا، اور غصہ ضبط کرتے ہوئے بولا

دیکھیں صغیر صاحب۔ میری ماں نے محنت، مزدوری کر کے مجھے حلال کا لقمہ کھلایا ہے۔ اور آپ مجھے حرام کی طرف راغب کر رہے ہیں، پلیز یہ فائل اٹھائیں اور تشریف لے جائیں۔ آپ غلط جگہ پر آ گئے ہیں۔

جواد صاحب دھیرے۔ دھیرے ہو جایئے اور بیٹھ جائیں۔

آج کے دور میں بھی آپ حرام و حلال کے مدار میں چکرا رہے ہیں - مہنگائی اور نفسانفسی کے عالم میں یہ سب زیب نہیں دیتا۔ میں ایک لاکھ کی آفر کر رہا ہوں۔ آپ سوچ کر مجھے دو دن کے بعد جواب دے دیں - فی الحال میں چلتا ہوں - آپ ٹھنڈے دماغ سے سوچیں گے تو فائدے میں رہیں گے۔ اور مزید فوائد سے بھی فیض یاب ہوتے رہیں گے۔ صغیر صاحب نے اُٹھتے ہوئے فائل بغل میں دابی اور اسے پُرنصیحت انداز میں سمجھاتے ہوئے کمرے سے باہر چلے گئے۔ جواد۔ انتہائی ضبط و صدمے کی کیفیت میں سر تھامے بیٹھا تھا۔ جسم پسینے سے تر تھا۔ سامنے بے شمار کام بکھرا تھا۔ میز کاغذات سے بھری تھی، کئی فائلیں ایسی تھیں جن پر صرف ایک دستخط اسے "لکھ پتی" بنا سکتے تھے۔

آپ اس مہنگائی اور نفسانفسی کے دور میں بھی حلال و حرام کی چکروں میں الجھے ہوئے ہیں۔ اس کے کانوں میں صغیر صاحب کی آواز گونجی۔

اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ پانی منگوا کر پیا، بمشکل کام مکمل کیا اور اس کے چکراتے ذہن کے ساتھ گھر آ گیا۔ دو کمروں کا گھر جس پر مرمت اور رنگ و روغن، نیا فرش، ان سب پہ بھی کافی رقم اُٹھ جانی تھی، وہ کئی دنوں سے تنخواہ میں سے بچت کے طریقے سوچ رہا تھا۔

سکینہ نے مرغی کے گوشت میں آلو ڈال کر مزیدار سالن بنایا تھا، مگر جواد کو بے ذائقہ محسوس ہوا۔ مہینے کے آخری دن تھے۔ جو تنخواہ آنی تھی۔ وہ ضروریات کے لٹیروں نے جھپٹ لینی تھی۔ بجلی، گیس کا بل، پانی کا بل، سکینہ کی دوائیاں، روزمرہ کے اخراجات، پٹرول کا خرچہ، سب کے سب تنخواہ کے مرہونِ منت تھے۔ ایسے میں دو، چار ہزار ہی بچتے تھے، پھر اس کی شادی کے اخراجات کھانا بھی اس نے بے دلی سے کھایا۔ سر درد کا بہانہ کر کے وہ کمرے میں آ گیا۔ کئی دن اس سوچ بچار میں گزر گئے، دوست خوب ترقی کر رہے تھے۔ طلحہ نے

گاڑی بھی لے لی تھی اور اک اچھے علاقے میں پلاٹ بھی اپنے نام کرا لیا تھا۔ اچھی طرز زندگی اور سہولیات ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔ مگر مہنگائی کے عفریت نے خواب چھین لیے تھے۔

یار تم سوچوں میں پڑو گے تو زمانہ قدیم میں جا گرو گے اور حالات کے ہاتھوں مارے جاؤ گے۔ طلحہ نے اس کی سوچوں میں رکاوٹ ڈالی، جواد اسے دیکھنے لگا۔ ہمت کرو یار۔ وہ اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں سمجھاتا اپنی سیٹ پر چلا گیا۔ شیطان آہستہ آہستہ اس پر وار کرنے کے لیے اپنے داؤ پیچ آزما رہا تھا۔ آخرکار جواد کلیم کا دماغ اس نے اپنے ہاتھوں میں دبوچ لیا۔

صغیر صاحب کے سامنے اس نے ان کی کھلی فائل پر دستخط کر ڈالے، اس کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ خون میں اُبال اُٹھ رہا تھا۔ جسم کانپ رہا تھا۔ احساس گناہ کا احساس اسے پانی پانی کر رہا تھا۔ تب اسے پینے کے پانی کی طلب ہوئی۔ اس نے گلاس بھرا اور غٹاغٹ پی لیا۔ گہرے سانس لیتے ہوئے دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کی طبیعت بحال ہونی شروع ہو گئی۔ حلال میں حرام کی آمیزش ہو رہی تھی۔ تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔ نئی سوچ، نیا رُخ اختیار کر رہی تھی، صغیر صاحب نے ایک لاکھ کی رقم اس کے سامنے رکھی۔ جواد کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

شکریہ جواد صاحب۔ بہت ممنون ہوں میں آپ کا۔ صغیر صاحب خوشی سے کھکھیاتے لہجے میں بولتے اس کا شکریہ ادا کرتے کمرے سے باہر چلے گئے۔

جواد نے رقم کا لفافہ دراز میں رکھا۔ اور کرسی کی پشت سے سر لگا دیا۔ طبیعت بحال ہوئی تو پیسوں کی موجودگی نے جیسے اس کے اندر توانائی سی بھر دی۔ زندگی میں آسانیاں نظر آنے لگی تھیں۔ اور اس نے ان آسانیوں کے بدلے میں آخرت کے لیے بہت گھاٹے کا سودا کر لیا تھا۔

لمحہ بھر کو ندامت نے سر اُٹھایا، مگر جواد نے خیالات کو جھٹک دیا۔ سب کر رہے ہیں۔ سسک سسک کر زندگی کیوں گزاری جائے، اب تک جو گزری ہے، گزر گئی، اب نہیں، بالکل نہیں۔ جواد نئی جون میں آ رہا تھا۔ اگلے چند ماہ میں اچھی خاصی رقم جمع ہو گئی تھی۔

یہ گھر، رہن سہن اسے اب کھٹکنے لگا تھا۔ یہ محلہ اور محلے دار اسے حقیر و فقیر محسوس ہونے لگے۔ حرام سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

سکینہ کے معمولی کپڑے، معمولی محلہ، اس کی سوچ کی پرواز بلند ہو رہی تھی۔

اماں۔ اب ہمیں اس گھر اور جگہ کو چھوڑ دینا چاہیے۔ ہم کسی اچھے علاقے میں گھر لے لیتے ہیں، جواد کے انداز و اطوار سکینہ کو

بدلے بدلے لگے۔

کیوں_ ہم شروع سے یہیں رہتے آرہے ہیں، یہ گھر چھوٹا سہی پر اپنا تو ہے، مجھے انسیت ہے اس گھر سے، تمھارے ابو کی خوشبو آتی ہے اس کے در و دیوار سے، سکینہ کھوئے ہوئے انداز میں بول رہی تھی، جیسے کہیں دور یادوں کی نگری میں جا بسی ہو۔ بے خودی سی ہو کر تمھارے ابو کی نشانی ہے۔ پرانا ہے تو کیا ہوا، تھوڑی بہت مرمت اور رنگ و روغن سے چمک اُٹھے گا۔ سکینہ کی آواز میں یادوں کی کھنک تھی۔

یہ اڑھائی مرلے کا گھر۔ وہ ماں کی باتوں سے چڑ کر بولا۔

اماں اب میں اچھی نوکری کرتا ہوں اور اچھی جگہ رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے اب یہاں نہیں رہنا۔ میں گھر دیکھ رہا ہوں۔ بہت غربت اور مفلسی کے دن دیکھے ہیں۔ اب اچھے ماحول میں رہنا ہمارا حق ہے۔ جواد، سکینہ کو قائل کر رہا تھا۔

مگر بیٹا، تمھاری تنخواہ اتنی کب ہے کہ گھر لے سکو؟

پہلے ہی بہت اخراجات ہیں اور اس قدر مہنگائی، سکینہ کو اس نے وہیں ہاتھ روک کر خاموش کرا دیا۔

میں کمپنی سے قرضہ لوں گا۔ آپ بس خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیں اور میری شادی بھی نئے گھر میں ہو گی۔ جواد حتمی فیصلہ سناتا باہر چلا گیا۔ تو سکینہ سوچ میں پڑ گئی۔

فردوس آئی تو سکینہ اس کے سامنے اداسی سے روتے ہوئے اسے بتانے لگی۔ فردوس کو بھی افسوس ہوا مگر وہ اگلے پل مسکرا کر بولی۔

نہ۔ نہ۔ سکینہ تو خوش ہو، تیرا بیٹا اس قابل ہو گیا ہے کہ تجھے سکھ دے سکے۔ اللہ سب کو ایسا بیٹا دے۔ وہ ہاتھ اُٹھا کر دعائیں دینے لگی، تو سکینہ بجھے دل کے ساتھ خود کو آمادہ کرنے لگی۔ جواد نے اس مکان کو بیچنا چاہا، مگر سکینہ نے سختی سے منع کر دیا۔ تب جواد نے پرانا سامان لے جانے سے انکار کر دیا۔ سکینہ نے ایک کمرے میں سامان سارا منتقل کر کے تالا لگا دیا، اور مکان کی چابی فردوس کو دے دی کہ آکر کبھی کبھار دیکھ لیا کرے۔

یوں اگلے ایک ماہ بعد وہ ایک نئے شاندار گھر میں آ گئی۔

دولت ہُن کی طرح جواد پر برس رہی تھی، اور وہ اس کی خمار آلود پھوار میں سہانے مستقبل کو مزید اجلا اور تابناک ہوتا دیکھ رہا تھا۔

جواد نے صفائی کرنے اور کپڑے دھونے والی خاتون کا بھی انتظام کر دیا۔ کھانا مگر سکینہ خود بناتی تھی۔ جواد کو اسی کے ہاتھ کا پسند تھا۔ ملازمین نہ ذائقے کا خیال رکھتے ہیں نہ صفائی کا۔ یوں زندگی اک نئے ڈھب پر چلنے لگی۔ اب تمھاری شادی ہو جانی چاہیے۔ بیٹا۔ سکینہ نے اسے پھر یاد کروایا۔

جی اماں۔ بس کچھ ماہ ٹھہر جائیں۔

اور ان کچھ ماہ میں جواد نے اپنی دلہن بھی تلاش کر لی تھی۔
صغیر صاحب کی دوسرے نمبر والی بیٹی تہمینہ، عرف ٹینا۔
شادی بھی اب اسے اپنے ہم پلہ لوگوں میں کرنی تھی۔ اپنا ماضی فراموش کر کے وہ حال میں رہنے والا انسان بن گیا، اور خوش حال مستقبل، ماضی کو کسی گرد کی طرح اس نے اڑا دیا تھا۔
سکینہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ جب وہ ٹینا کو گھر لے آیا اور ایک دن، اماں یہ ٹینا ہے، ہم جلد شادی کرنے والے ہیں۔ گوری، چٹی، لمبی خوبصورت ٹینا۔ مختصر لباس اور چھوٹے چھوٹے کٹے بالوں کے ساتھ حسن کی بجلیاں گراتی وہ جواد کو پاگل کر رہی تھی۔ بلکہ پاگل کر چکی تھی۔
سکینہ دل تھام کر صوفے پر بیٹھ گئی۔
ہیلو_ آنٹی، دلبرانہ ادا سے کہتی وہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر کسی مطلق العنان حکمران کی طرح بیٹھتے ہوئے بولی۔ نیل پالش سے رنگے ہاتھ پاؤں کے ناخن، پنسل ہیل۔ تیز میک اپ۔ خوشبو بکھیرتی، سکینہ کے حواس مختل کرنے لگی۔
سکینہ کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔
غفوراں کو ٹرالی سجا کر لانے کا کہہ کر جواد اندر آ گیا۔
اماں یہ میرے بہت اچھے کلائنٹ صغیر صاحب کی بیٹی ہے۔
جواد جانے کیا کہہ رہا تھا۔ سکینہ خاموش بیٹھی تھی۔ کچھ کہنے کی جرأت و جسارت ہی نہ تھی۔ نہ مزاحمت کا موقع جواد نے اسے کہنے، سننے کچھ بھنے، بولنے کا موقع ہی کب دیا تھا۔
جواد_ ڈھیروں خورونوش کا سامان لایا تھا۔ ٹینا کے ساتھ کھاتے ہوئے وہ مزیدار چیزوں سے انصاف کر رہے تھے۔ سکینہ کو بھی شامل ہونے کو کہا۔ مگر وہ کب ایسی چیزیں کھاتی تھی۔
اوکے مام، ہم اب چلتے ہیں۔ رات کو ڈنر کر کے آؤں گا میں آپ کھانا، کھا کر دوائی وقت پر لے لیجیے گا، جواد جاتے جاتے بولا۔
جب بت بنی سکینہ کے گال پر پیار کر کے ٹینا اوکے بائے کرتی جواد کے پیچھے چلی گئی۔
سکینہ کا دل تھم کر رہ گیا، کہاں میری تربیت میں کمی رہ گئی تھی، جواد سرتاپا بدل گیا تھا اس کے رات، دن اس کے معمولات، رہن سہن میں فرق۔ نماز بھی کبھار کبھار پڑھنے لگا تھا، قرآن پاک کو ایک مدت ہوئے اس نے کھول کر نہ دیکھا تھا مصروف مصروف اور صرف مصروف تھا، کہاں مصروف تھا؟ کہ فراغت ملنے پر بھی میسر نہ تھی سکینہ وضو کرنے کے دوران بھی انہی سوچ کی بھول بھلیوں میں غلطاں تھی۔

اور سجدہ ریز ہو کر بے اختیار رو پڑی۔ حلال اور حرام۔ اس کے دماغ میں جیسے کوئی بجلی کوندی، اور جسم پر چیونٹیاں رینگنے لگی تھی۔

جواد۔ جواد تو ایسا نہ تھا۔ وہ تو ہر نوالے پر خدا کا شکر ادا کرتا تھا۔ روکھی سوکھی کھا کر بھی۔ پیٹ بھر کر انھیں کبھی غذا ملی ہی نہ تھی۔ اب اتنا پیسہ۔ یکدم اتنا پیسہ۔ اتنا پیسہ حلال کی کمائی نہیں ہو سکتی۔ یہ ''اوپر'' کی کمائی ہے۔ شیطانی کمائی ہے۔

بے حس کر دینے والا پیسہ، رب کے احکام بھلا دینے والا پیسہ، اجنبیت کی دیواریں کھڑی کرنے والا پیسہ۔ غرور و تکبر و لالچ کی پیداوار۔

محبتوں اور احساس کو نگل جانے والا پیسہ۔ اچھے برے کی تمیز ختم کر دینے والا پیسہ۔ دل و دماغ تبدیل کرنے والا نسخہ۔

میرا جواد ایسا نہ تھا۔ جب تک اسے میں نے محنت مزدوری کر کے حلال کھلایا۔ وہ میرا تھا۔ جب سے اس نے دنیاداری اور بے راہ روی دیکھی، طمع و لالچ اس کے لہو میں گردش کرنے لگی۔ تو وہ حلال و حرام کا فرق بھول گیا۔ یاد رہا تو بس، پیسہ، امارت، دکھاوا، شیطان اس کے دماغ پر قابض ہو گیا ہے۔

سکینہ روتی، سسکتی، سجدے میں پڑی پیشانی رگڑتی مسلسل گریہ میں مبتلا تھی۔ اور بے بسی سے خدا سے فریاد کر رہی تھی۔

میں کیا کروں میرے مالک۔ میری مدد فرما۔ اس کو، مجھے اس گندگی سے نکال دے۔ مجھے صراط مستقیم دکھا۔ آمین

جانے کب تک وہ روتی رہی۔ یہاں تک کہ غفوراں نے آ کر اسے آواز دی وہ جانے کے لیے اجازت طلب کر رہی تھی۔

سکینہ نے سر اُٹھا کر چہرہ صاف کیا۔ اسے اچھی طرح لاک کر کے دروازہ بند کرنے کا کہہ کر جائے نماز تہہ کرنے لگی۔ غفوراں بنا کچھ کہے واپس پلٹ گئی۔

سکینہ کے بے چین دل و دماغ قابو میں نہ آ رہے تھے۔

جواد اب جس طرزِ زندگی کا عادی ہو چکا ہے، جن راہوں کا مسافر بن گیا ہے، وہاں سے اس کا پلٹنا ممکن نہ تھا۔ ہاں۔ ہاں، مگر میں پلٹ سکتی ہوں۔ واپس لوٹ سکتی ہوں جا سکتی ہوں۔ اپنے گھر میں۔

میں اب اس حرام کی کمائی کا ایک نوالہ بھی نہ کھاؤں گی۔ عزم مصمم کرتی اس نے آج جواد سے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور فردوس کو فون کر کے اپنے گھر لوٹنے کا کہا۔ اس نے دل میں اک فیصلہ کر لیا تھا کہ اب حلال کمائے حلال کھائے گی محنت مزدوری کر کے

.....

رات جواد آیا۔ خوشی اس کے چہرے سے واضح تھی، ماں کو گم سم بیٹھا دیکھ کر حیران ہوا، اور آگے بڑھ کر اس کے برابر بیٹھ کر بولا۔

کیا بات ہے ماں۔ کوئی پریشانی، طبیعت تو

ٹھیک ہے ناں؟ اس کے لہجے میں تشویش تھی۔ سکینہ کو اس کے سارے عمل اب ڈرامہ لگتے تھے۔

میں یہاں سے جا رہی ہوں، اپنے اسی گھر میں، شکر ہے کہ تمھارے اصرار پر میں نے وہ گھر نہیں بیچا تھا۔ سکینہ نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ اس کے بدلے ہوئے مضبوط لہجے پر جواد چونکا۔

کیوں ماں_ یہ بھی آپ کا گھر ہے، ہمارا گھر ہے، میں آپ کے بغیر کیسے_ نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ جواد یکدم پریشانی سے بولا، بات اصل کیا تھی وہ جاننے سے قاصر تھا۔

میں نے تمھیں اب تک حلال کا لقمہ کھلایا، جیسے ہی تمھارے پیٹ میں حرام گیا، تم بدل گئے، فرق بھول گئے اب میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ تم خدا کو بھول کر، حلال کو فراموش کر کے حرام خور بن گئے ہو۔ اور میں یہ گوارا نہیں کر سکتی،

میں قناعت پسند ہوں، اور تمھیں بھی وہی درس دیا تھا۔ مگر روپے، پیسے کی لالچ نے۔ ہوس کے زور نے تمھارے اندر سے ساری اخلاقیات ختم کر ڈالی ہیں۔ مجھے روکنا مت، اب میری اور تمھاری راہیں جدا ہیں۔ میرے بازو سلامت ہیں۔ میں محنت، مزدوری کر کے بچوں کو قرآن پڑھا کر اپنی آخرت سنواروں گی۔ تم نے خدا کو بھلا دیا۔ اس کے احکامات کو فراموش کر دیا۔ ماں کیا چیز ہے تمھارے نزدیک؟ تم نے تو اس عالیشان ہستی کے ساتھ بے ایمانی کی ہے۔ جو رب العالمین ہے۔ اس کی حیثیت تمھارے سامنے کچھ نہیں تو ماں کیا ہے؟

مگر اماں۔ جواد پسینہ پسینہ ہو کر ممنایا۔

بس مجھے اور کچھ مت کہنا، صبح ہوتے ہی چلی جاؤں گی، میرا رب مجھے معاف کرے میں تمھارے ساتھ مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتی، روکھی سوکھی کھا کر زندگی کے دن پورے کر لوں گی، میں نے فردوس سے کہہ دیا ہے کہ میں گھر میں کریانہ کی دکان کھول کر حلال کماؤں گی، میرا جو سامان ہے وہ میرے ساتھ کر دینا، سٹور سے نکلوا کر۔

جاؤ تم آرام کرو۔ سکینہ کہتی ہوئی اپنے بستر کی طرف بڑھ گئی۔ اسے اس بستر پر کانٹے چبتے محسوس ہو رہے تھے، مگر وہ مطمئن تھی، کہ اس نے درست فیصلہ کیا ہے۔ فردوس کے دونوں بیٹے اس سے قرآن پاک پڑھ کر گئے، اس کی بہت عزت کرتے تھے، بلکہ پورا محلہ ہی اس کی تکریم کرتا تھا، اسے کوئی پریشانی نہ تھی۔ اس نے جو فیصلہ کیا تھا، اپنی آخرت کو سنوارنا تھا، قبر کی سختی اور قیامت کی رسوائی سے خود کو بچانا تھا اور جواد کے لیے ہدایت کی دعائیں بھی کرنی تھیں کہ کسی نہ کسی دن ضرور اس روش کو چھوڑ دے گا۔

ان شاء اللہ

☆☆☆☆☆

دوسری لڑکی [ملائیشین ادب سے]

پچاسیویں دہائی کے لگ بھگ کی بات ہے، لیونگ چن اُس وقت پانچ برس کی تھی۔ اس کا ایک بڑا بھائی تھا جس کی عمر آٹھ برس اور بڑی بہن کی عمر چھ سال تھی۔ اس لیے، اس فہرست میں، اُس کا تیسرا نمبر تھا اور دادی کی نظر میں، وہ صرف ایک دوسری ناپسندیدہ لڑکی تھی۔

اُن دنوں، چین کی بہت سی دادیاں، پوتیوں کے بجائے پوتوں کی پیدائش کو زیادہ پسند کرتی تھیں اور اس وجہ سے، لیونگ چن کو خاندان میں ایک اضافی بوجھ سمجھا جاتا تھا کیونکہ خاندان میں پہلے ہی ایک لڑکی اُس کی بڑی بہن کی شکل میں موجود تھی۔ اگرچہ اُس کی ماں اس سے بے حد محبت کرتی تھی جبکہ اُس کی دادی کے دماغ میں اسی خیال نے جڑ پکڑ لی تھی کہ گھر میں ایک اور پوتی کا ہونا پریشانی کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ اس لیے، پسندیدگی اور غیر پسندیدگی کی اس غیر منصفانہ جنگ میں، وہ تینوں بچوں میں سے سب سے برا سلوک اس کے ساتھ کرتی۔ وہ دوسرے دونوں بچوں پر خوب مٹھائیاں اور ٹافیاں اور نئے کپڑوں کی برسات کرتی لیکن لیونگ چن کے مقدر میں وہی آتا جو باقی دونوں بچوں سے بچ جاتا۔ پانچ سال کی اس چھوٹی سی عمر میں، لیونگ چن پر رتی برابر بھی اثر نہ پڑا۔ لیکن کبھی کبھار وہ حیران ہوتی کہ دادی اُس کے باقی بہن بھائیوں کو ہمیشہ اُس سے اچھا کیوں کھانے پینے کو دیتی ہے اور پھر وہ اپنی ماں سے اس کے متعلق سوال کرتی، جب اُس کی ماں ربڑ کے درختوں کا شیرہ جمع کرنے کے بعد واپس آتی۔ اُس کی ماں کو واضح طور پر ساری صورت حال سے آگاہی تھی کہ اُس کی ساس اس چھوٹی بچی کے ساتھ واقعی بہت ہی ناروا سلوک رکھتی تھی اور اس کی معصومیت کا خوب فائدہ اُٹھاتی لیکن اُس کو کبھی احساس نہ ہوا کہ لیونگ چن بہت ذہین بچی تھی۔ اس کے باوجود، زندگی جاری رہی۔ دادی کے غصہ سے نجات حاصل کرنے کے لیے، لیونگ چن صبح سویرے ہی جاگنا پسند کرتی

سیسیلیا اونگ، کوچنگ

مترجم: حمزہ حسن شیخ

اور کبھی کبھار تو رات کے دو بجے بھی، تاکہ وہ ماں کے ساتھ ربڑ کے کھیتوں کے جانب جا سکے، اور وہاں اپنی ماں کی خالی بالٹیاں اور ربڑ کاٹنے کے چاقو کو اُٹھانے میں مدد کرے۔ ماں اُس کو گرم گرم لباس پہناتی جب بھی وہ ماں کے ساتھ جاتی۔ جیسے ہی ربڑ کا شیرہ جمع کرنے کا مرحلہ شروع ہوتا، لیونگ چن، شیرہ جمع کرنے والا چاقو لے کر کبھی کبھار اپنی مہارت کا مظاہرہ کرتی اور اکثر اوقات، جب تک شیرہ جمع کرنے کا مرحلہ اختتام پذیر ہوتا، اُس کے سارے بال شیرے سے الجھ چکے ہوتے۔

صبح کے دس بجے، وہ ناشتا کرنے کے لیے واپس گھر آتے اور اس کی ماں کچھ چاول اور نمکین مچھلی ناشتے کے لیے پکاتی۔ ناشتے کے بعد، اُس کی ماں بیٹھ کر اُس کے بالوں سے شیرہ صاف کر کے اُس کے بالوں میں کنگھی کر دیتی۔ اس کے بعد، وہ واپس کھیتوں کی جانب شیرہ جمع کرنے کے لیے چلی جاتی اور پیالوں میں جمع کیا ہوا شیرہ وہ بالٹیوں میں اُنڈیل دیتی تاکہ اُسے بعد میں، ربڑ کے گودام میں لایا جا سکے۔ جہاں پر اکٹھے کیے گئے شیرے کو تیزاب کے ساتھ ملایا جاتا اور اس کو مناسب شکل میں ڈھلنے کے لیے مختلف سانچوں میں اُنڈیلا جاتا۔ سانچوں سے مخصوص وقت کے بعد، اس دھتے ہوئے شیرے کو باہر نکالا جاتا اور اس کو مطلوبہ چوڑائی میں ڈھالنے کے لیے ایک دباؤ سے گزارا جاتا۔ اس کے بعد، ربڑ کی ان ساری تہوں کو سوکھنے کے لیے دخانیہ میں لٹکا دیا جاتا تاکہ اُن کو ڈھیر بنا کر بازار میں بھیجا جا سکے۔

ایک صبح، لیونگ چن بہت تاخیر سے جاگی۔ اُس کی ماں پہلے ہی کام پر جا چکی تھی اور آہستہ آہستہ بوندا باندی ہو رہی تھی۔ اُس نے اپنی ماں کے پیچھے جانے کے لیے سوچا لیکن اُس کی سمجھ بوجھ میں، اُس کی لیے ربڑ کے ان وسیع و عریض کھیتوں میں اپنی ماں کا راستہ تلاش کرنا آسان اور محفوظ عمل نہ تھا۔ وہ اپنا راستہ کھو بھی سکتی تھی۔ اس لیے اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے گھر کی دہلیز پر بیٹھ کر، اپنی ماں کے گھر واپس آنے کا انتظار کرے گی۔ اس اثنا میں، اُس کے بہن اور بھائی، باورچی خانے کی بڑی کھانے کی میز پر براجمان ہو چکے تھے اور اس کی دادی اُن کے لیے گرم گرم چاول دلیہ پلیٹوں میں نکال رہی تھی۔ گرم چاولوں کی خوشبو اتنی شہوت انگیز تھی کہ لیونگ چن کا پیٹ بھوک سے بلبلانے لگا۔ اس لیے وہ بھی، اُن سے کچھ دور لمبی میز کے آخری کونے پر جا کر بیٹھ گئی، اس اُمید کے ساتھ کہ اُس کی دادی شاید اس کے لیے بھی کچھ تھوڑا سا چاول دلیہ نکال دے گی۔ تاہم یہ سب ہونے کے بجائے، بُری دادی نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرنا شروع کر دیا اور پُوچھا، کہ وہ کیا چاہتی ہے اور وہ اس کھانے کی میز پر کیوں آئی ہے؟۔

لیونگ چن نے اپنی کمزور ڈری ہوئی آواز میں جواب دیا،

”دل ---دل-- میں بھی بھوکی ہوں--- مجھے بھی تھوڑا دلیہ چاہیے۔“

اُس کی دادی نے گھور کر اُسے دیکھا، چاولوں کا ایک پیالہ نکالا اور بھاپ اُڑتا ہوا دلیہ اُس پیالے میں بھرنے لگی۔ لیکن پیالہ لیونگ چن کے سامنے رکھنے کے بجائے، اُس نے گرم گرم دلیہ کا پیالہ میز پر اُس کی جانب دھکیل دیا۔ گرم گرم دلیہ کا پیالہ میز پر لڑھکا گیا اور سیدھا لیونگ چن پر جا گرا۔ لیونگ چن خوف اور درد کی شدت سے چلانے لگی کیونکہ پیالہ میز سے اُچھل کر سیدھا اُس کی گود میں جا کر خالی ہوا۔ اُس کی بہن اور بھائی، اُس کی مدد کرنے اور تسلی دینے کے دوڑے چلے آئے۔ لیکن اُس کی دادی نے ایک بار پھر اُس کو بُری طرح ڈانٹ دیا کہ وہ اتنی بیوقوف ہے کہ گرم گرم دلیے سے اتنی بے پروائی برتتی ہے۔ وہ چیختی چلاتی معصوم لڑکی کو اپنے کمرے میں گھسیٹتی ہوئے لے گئی اور اُس کے اس شیطانی عمل کی دوا دارو کے طور پر اُس کے جلدی سے اُبھرتے ہوئے چھالوں پر مرہم پٹی کرنے لگی۔ بعد میں، لیونگ چن، خاموشی سے سسکیاں لیتے ہوئے گھر کی دہلیز پر بیٹھ کر اپنی ماں کا گھر جلدی واپس آنے کا انتظار کرنے لگی۔ جب اُس کے آنسو اُس کی گالوں پر پھسل رہے تھے تو وہ حیرت سے سوچ رہی تھی کہ اُس کی دادی اُس سے اتنی نفرت کیوں کرتی ہے؟ اُس نے اتنا کیا غلط کیا ہے؟ اُس کی دادی صرف اُس کے ساتھ امتیازی سلوک کیوں کرتی ہے جبکہ اُس کے بہن بھائیوں کے ساتھ نہیں؟

جونہی اُس کی ماں واپس آئی تو اُس کو ساری صورت حال کا اندازہ ہوا اور وہ اپنے غصے پہ قابو نہ پا سکی۔ اب تو ہر حد پار ہو گئی تھی۔ اس معصوم بچی نے ایسا کیا کیا تھا کہ اُس کے ساتھ اتنا ظلمانہ سلوک کیا گیا تھا؟ اُس کا اپنی ساس کے ساتھ خوب جھگڑا ہوا اور اُس نے پختہ ارادہ کر لیا کہ وہ یہ ظالم گھر چھوڑ دے گی اور اپنے خاوند کے پاس جائے گی جو کہ ایک دوسرے شہر میں اپنا کاروبار کرتا تھا۔ اُس نے اس ظالم عورت کا اپنے بچوں کے ساتھ ظلمانہ سلوک کو کافی برداشت کر لیا تھا اور خاص طور پر چھوٹی لیونگ چن کے ساتھ۔ اُس دن شام کو، وہ اپنے اور اپنے تینوں بچوں کے لیے ریل کی ٹکٹیں نیچے گاؤں سے لے آئی۔ اس سلسلے کو ایک ہی بار ہمیشہ کے لیے ختم ہونا تھا اور اُس کے پاس گھر چھوڑنے کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا۔ وہ اپنے خاوند کے ساتھ کیوں نہیں رہتی تھی، اس کی صرف ایک وجہ تھی کہ اُسے اس بوڑھی عورت کی تنہائی کا احساس تھا۔ اب، اُسے یہاں رُکنے کے لیے دُنیا کی کوئی طاقت نہیں رُوک سکتی تھی، شاید کوئی بہت ہی خاص وجہ----

بیس سال بیت گئے تھے۔ لیونگ چن اب پچیس برس کی ہو گئی تھی۔ اُس کے دونوں

ماں باپ جوانی میں فوت ہو گئے تھے۔ اب وہ ایک کامیاب تاجر خاتون بن گئی تھی جس نے معاشیات اور کاروباری امور میں اپنی تعلیم مکمل کر لی تھی۔ اُس کے دونوں بہن بھائیوں نے شادی کر لی تھی اور ملک چھوڑ کر باہر چلے گئے تھے۔ انہی دنوں، اُس کو اپنی دادی کی بیماری کی خبر موصول ہوئی۔ بوڑھی بزرگ کو دل کا عارضہ لاحق تھا اور اس کی صحت بگڑتی جا رہی تھی۔ لیونگ چن کو گرم گرم دلیہ والا واقعہ ابھی تک نہیں بھولا تھا۔ اگرچہ اس واقعے کو بیس برس بیت چکے تھے۔ اُس کے لیے یہ واقعہ ایسے ہی تھا جیسے ابھی کل کی بات ہو جب کبھی بھی وہ اپنی ران پر جلنے کے بڑے بڑے بھدے نشان دیکھتی۔ کبھی کبھار، وہ ابھی بھی وہی جلا دینے والا درد محسوس کرتی جب گرم گرم دلیہ اُس کی گود میں گرا تھا اگرچہ اُس نے اپنی دادی کو اُس واقعہ پر معاف کر دیا تھا۔ اُس نے ایک بار اپنی ماں سے پوچھا تھا کہ اُس کی دادی اُس کے ساتھ ایسا امتیازی سلوک کیوں کرتی تھی؟

ایک صبح، جب وہ کام پر جانے کے لیے تیار تھی تو لیونگ چن کو اپنی خالہ کی جانب سے ایک ٹیلی گرام موصول ہوا کہ اُس کی دادی کی وفات ہو گئی تھی۔ اُس کے جنازے میں اُس کی شرکت لازمی تھی۔ لیونگ چن کو اُمید تھی کہ دادی کے دونوں پسندیدہ بچے، اُس کا بڑا بھائی اور بہن، جنازے کے لیے گھر ضرور آئیں گے۔ لیکن افسوس کہ اُن کے پاس اچھا بہانہ تھا کہ وہ اس وقت بہت دور تھے اور گھر آنے کے لیے یہ بہت ہی مختصر وقت میں تاخیری اطلاع تھی۔

جب وہ اُس پُرانے بے ترتیب ماں باپ کے گھر میں پہنچی تو دردناک یادوں کے ایک سیلاب نے اُس کو گھیر لیا۔ جیسے ہی وہ دادی کے جنازے کے ساتھ بیٹھی، اُس نے خاموشی سے بوڑھے جھریوں سے بھرے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ اُس کو یوں محسوس ہوا جیسے اُس کی دادی سو رہی ہے، اُس کے چہرے پر ایک بہت ہی سکون تھا۔ دل کی گہرائیوں میں، اُس نے دُعا کی کہ خدا اُس کی دادی کی رُوح کو بخشے، اس کے باوجود کہ اُس نے جو کچھ بھی برداشت کیا تھا۔ غم کے آنسو اُس کی گالوں پر پھسلتے چلے گئے، جب اُس نے خاموشی سے اپنی دادی کے لیے دُعا کی جس سے وہ بھرپور محبت کرتی اگر اُس کو ایسا کوئی موقعہ میسر آتا۔ اُس نے یاد کیا کہ اُس کی مرحومہ ماں نے اُس کو بتایا تھا، جب اُس نے پوچھا تھا کہ اُس کی دادی اُس کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کرتی ہے -- اُس کا کیا قصور ہے؟

بوڑھی عورت بھی اپنے بچپن میں ایسے ہی حالات سے گزری تھی اور اپنی دادی کی محبت سے محروم رہی تھی -- صرف و صرف اس لیے کہ وہ بھی پیدا ہونے والی — دوسری لڑکی تھی۔

☆☆☆☆☆

منّی کہانیاں

عشق

گاؤں کے اُوپر سے گزرتی بجلی کی تاروں کے اُوپر بیٹھے کبوتری نے کبوتر سے پوچھا، ''یہ مُویا عشق کیا ہوتا ہے؟؟''

کبوتر نے قریب سے گزرتی دوسری تار کو چپ چاپ اپنی چونچ سے چُھولیا!!!

☆☆☆☆☆

کپاس

ماں کی عادت تھی جب بھی بازار جاتی تو اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کو بہت ساری باتیں بتاتی جاتی وہ دونوں ماں بیٹی گرمیوں کے کپڑے خریدنے نکلی تھیں ماں دُکانوں کے باہر کپڑوں کے سٹالوں کو دیکھتے ہوئے بولی، ''یہ کپڑا کپاس سے بنتا ہے یہ کپاس کے پھول کھیتوں میں کھلتے ہیں یہ پُھول پراسس ہوتے ہیں اور کپڑا بناتے ہیں!!!''

سامنے سے انتہائی مختصر لباس زیبِ تن کئے اٹھکھیلیاں کرتی لڑکیوں کو گزرتے دیکھ کر بیٹی نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا، ''ہمارے ملک میں کپاس کم اُگتا ہے کیا ماں؟؟؟''

☆☆☆☆☆

ہمارے شہر

ایک بندہ بھاگے جا رہا تھا اپنے پیچھے آوازیں لگائے جا رہا تھا ''بھاگ جاؤ خدا کی قسم بھاگ جاؤ ورنہ مارے جاؤ گے تباہ ہو جاؤ گے بھاگ جاؤ بچ جاؤ گے'' پیچھے سے آواز دیتے ہوئے کوئی پکارا، ''پاگل ہو گئے ہو؟ جنگلوں میں بھاگے جا رہے ہو بلکہ تم مارے جاؤ گے بچ جاؤ وہاں تو درندے ہوتے ہیں!!''

آگے بھاگتے ہوئے بندے نے منہ پیچھے کرتے ہوئے کہا ''سارے درندے تو شہروں میں آچکے ہیں!!''

اُس کے پیچھے اُس کی بیٹیاں بھی بھاگی جا رہی تھیں۔

☆☆☆☆☆

نجم رضوی

عاشقان لقمہ وجام [طنز ومزاح]

واقعی ایسے عاشق نرالے اور عجیب ہی ہوتے ہیں!!!

ہماری اس حسین ورنگین لیلائے آب وگل موسوم بہ دنیا میں عاشقان مستانہ کی کمی کبھی بھی نہیں رہی - ہزاروں لاکھوں عاشقان ہنرمند ہمہ وقت محبوب کی اداؤں اور سراپے پہ مرمٹنے کے لئے مستعد وتیار رہتے ہیں بلکہ بقول شاعر بعض اوقات تو صورت حال کچھ اس طرح کی دکھائی دے جاتی ہے کہ؛

ہزاروں مرچکے ہیں سینکڑوں تیار بیٹھے ہیں!!!

مگر افسوس کہ اس حقیقت سے ہم مسلسل و متواتر چشم پوشی برتتے چلے آرہے ہیں کہ عاشق اور چاہنے والے صرف لیلائے خاکی یعنی گوشت پوست کے بنے صنم ہی کے لئے موجود نہیں ہوتے بلکہ کسی بے چارے محبوب کو بدنام کئے بغیر بھی عاشق صادق ہمارے ہاں موجود رہتے ہیں- جی ہاں! سبزہ نورستہ کے اس وسیع دسترخوان پر ''کھانے'' کے عاشق بھی لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں نہ صرف آباد وموجود ہیں بلکہ مارے مارے بھی پھر رہے ہیں-

پھرتے ہیں گوشت خور کوئی پوچھتا نہیں!!!

اردو قواعد کی رو سے ''کھانا'' فعل ہے اور حکیم ماہر نادم آبادی کی نظر میں یہ فعل لازم جاری کی ایک دلکش ودلچسپ شکل ہے - ان کا خیال ہے کہ روئے زمین پر چونکہ انسان کا بنیادی کام کھانا ہی قرار پایا ہے اس لئے نسل انسانی کی بقا کے لئے ضروری ہے کہ ''کھانا'' ہر وقت لازمی سامنے موجود ہو- یہی وجہ ہے کائنات میں کھانے اور کھلانے کا عمل کبھی رکتا نہیں بلکہ ہر وقت کسی نہ کسی صورت میں جاری وساری رہتا ہے (انسانی وجود کی حسین تخلیق کے ساتھ ہی منہ اور اس کے اندر اگنے والے بتیس دانت اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ منہ کا مقصد اولین کھانا اور چبانا ہی ہے جبھی تو ہم دیکھتے ہیں کہ دانتوں کے گرتے ہی انسانی وجود کا قلعہ رفتہ رفتہ مسمار ہونا شروع ہوجاتا ہے)- ''کھانا'' دراصل وہ فعل لازم ہے

نور کمال شاہ

جس کا فاعل یعنی کھانے والا ہمیشہ حاضر و موجود ہی رہتا ہے- بالفاظ دیگر جہاں کھانا ہوگا وہاں کھانے والے بھی لازماً جمع ہوں گے- آپ چاہیں حکیم صاحب سے لاکھ اختلاف کرلیں، دراصل وہ ہر اس عمل کو فعل تصور کرتے ہیں جس کے ساتھ "نا" کا صیغہ لگا ہوا ہو- ان کی نظر میں بھاگنا، ڈرنا، گانا، ہنسنا، دوڑنا اور کھانا وغیرہ تمام افعال ہیں کیونکہ ان سب میں کرنے یا نہ کرنے دونوں کا واضح حکم ایک ساتھ موجود ہے- اب انحصار سننے والے پر ہے چاہے تو مطلوبہ عمل کرے چاہے اس سے احتراز کرے- وضاحت کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں، بھاگ نا فعل اس لئے کہ اس میں بھاگنے یا نہ بھاگنے کا اشارہ بیک وقت موجود ہے- اب بندہ اپنی صورت حال اور موقع کے مناسبت سے خود ہی فیصلہ کرلے کہ فی الحال بھاگنا مناسب ہے یا نہ بھاگنا ہی ٹھیک رہے گا- بالکل اسی طرح ہنسنا میں "ہنس" اور "نا" دونوں طرح کے آپشن موجود ہیں؛ اب چاہے تو کوئی ہنسے چاہے نہ ہنسے-

حکیم صاحب کا نظریہ ہے کہ اچھی صحت اور بہتر طاقت کے لئے کھانا اور بے تحاشا کھانا از حد ضروری ہے- ان کی رائے میں مردان باہمت ہمیشہ اپنا سر ہتھیلی اور ہاتھ تھالی میں رکھنا پسند کرتے ہیں- اور یہی ان کی دنیوی کامیابی کا سہانا راز بھی ہے- منہ اور آنکھ دونوں میں بیک وقت پانی لاتے ہوئے ایک بار کسی مرحوم دوست کا ذکر کرتے ہوئے فرمانے لگے، "اللہ بخشے مرحوم کیا کیا خوبیاں لے کر پیدا ہوئے تھے- دسترخوان پر پورا تسلط جما کر بیٹھتے تھے- مجال ہے جو کوئی پلیٹ یا ڈونگا ان کی دست قدرت سے باہر ہو- سامنے موجود دیگر شرکائے طعام کے سامنے کسی ایسے موضوع کا پتا پھینکتے جس پر بحث ضروری ہو- دیگر لوگوں کو بحث میں الجھا کر خود اپنی ساری توجہ کھانے کی جانب فرماتے- دسترخوان پہ تشریف لانے سے قبل ایسے شرکا کا انتخاب کرتے جو ان کی نظر میں کم خوراک ہوتے- پہلے ہی سے ان کا قرب حاصل کرکے انہیں اپنے ساتھ دسترخوان پہ بٹھاتے؛ اللہ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے کیا عجیب شخص تھے-"

عوامی شاعر نظیر اکبر آبادی نے اپنی شہرہ آفاق نظم "روٹی نامہ" کھانے سے متاثر ہوکر ہی لکھی (بلکہ ان کی نظم "ظالم پیٹ"

بھی روٹی اور طعام ہی کی محبت میں لکھی گئی ہے)۔ یہ واقعی ایک شاندار نظم ہے جس پر ہمیں سب سے بڑا اعتراض یہی ہے کہ اس میں بجائے یہ کہ روٹی کی قدر و منزلت واضح کر کے اسے داد و شاباش دی جاتی الٹا اسے منفی انداز میں پیش کر کے اسے انسانی کمزوری قرار دے کر اس کا درجہ گھٹانے کی بھونڈی کوشش کی گئی ہے۔ کھانا اور روٹی ایک ایسا سپہ سالار ہے جو ہر میدان میں ہمیشہ خود کو فاتح ہی ثابت کر چکا ہے۔ ضیافتوں اور عشائیوں میں اسی ہتھیار کو استعمال کر کے ہی متاصد اور کامیابیاں سمیٹی جاتی ہیں۔ سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو روٹی ہی بہترین نعرے کے طور پر سامنے آئی۔ تاریخ گواہ ہے کہ ''روٹی کپڑا مکان'' کے دلکش نعرے نے کیسے ایک سیاسی پارٹی کو زمین سے اٹھا کر آسمان تک بلند کر دیا۔ ''روٹی'' کے نام سے باقاعدہ فلمیں بھی بنیں اور روٹی جیسی نعمت سے محروم عوام نے بھی اس امید پر اسے دیکھا کہ شاید اس میں روٹی تک رسائی کا کوئی آسان راستہ اور بہتر طریقہ بجھایا گیا ہو۔

کھانے کی اسی اہمیت اور قدر و منزلت کو دیکھ کر ہم سب لگے ہوئے ہیں: باقاعدگی سے کھا رہے ہیں؛ کھلا رہے ہیں اور جانیں بنا رہے ہیں۔ خود کو زیادہ روٹی شناس ثابت کرنے لئے اکثر ہم بے قاعدہ کھانا بھی شروع کر دیتے ہیں۔ سر ہتھیلی پہ رکھے ہم ہر تھالی میں کودنے پہ تلے بھی رہتے ہیں۔ کھا کر ہی دوست بنتے ہیں اور کھلا کر نئے دوست بھی بناتے ہیں۔ قوانین ہمارے سامنے ہار جاتے ہیں؛ اصول و قواعد ہمارے آگے دم توڑ دیتے ہیں۔ ہر وہ انداز اور ہر وہ طریقہ ہم اپناتے ہوئے ذرا سا بھی نہیں ہچکچاتے جس سے ہمیں کھانے تک رسائی ملے۔ ہم اپنا مقام و مرتبہ محفل میں اپنے سامنے پیش کردہ ''کھانے'' سے لگاتے ہیں۔ کسی بھی تقریب سے واپسی پر دادی اپنے پوتے پوتیوں سے یہ ضرور پوچھتی ہیں کہ بھئی! بتاؤ بھلا، کیا کیا کھانے کو ملا؟

الغرض ''کھانا'' اور روٹی آج ہماری زندگی کا حاصل بن چکی ہے۔ بچے کے رشتے کی بات اس وقت تک نہیں چھیڑی جاتی جب تک وہ ''کھانا'' کمانے کے قابل نہ بن جائے۔ دنیا پہ ایک طرح سے کھانے کی حکمرانی ہے اور یہ حکمرانی لازوال ہے۔

☆☆☆☆☆

نابغہء روزگار کتے

جون ۲۰۱۰ میں ماسکو آمد کے بعد جانداروں کی جن دو اقسام کی از حد کمی محسوس ہوئی وہ بچے اور پرندے ہیں۔ ماسکو درختوں میں ڈوبا ہوا شہر ہے۔ شہر کے عین وسط میں بھی درختوں کی بہتات ہے کیونکہ قانون کے مطابق شہر کا تیسرا حصہ درختوں پر مشتمل ہونا چاہیے۔

لیکن عجیب بات ہے کہ پرندے نہ ہونے کے برابر ہیں - سب سے زیادہ تو کبوتر ہیں اور چڑیاں بھی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ شہر میں چرندوں اور دوسرے جانوروں کی بہتات ہے۔ جانوروں کی کمی کو کتوں کی بہتات سے پورا کیا گیا ہے۔ بلا تخصیصِ جنس روسی زن و مرد کتے پالنے کے شوقین ہیں۔ یہاں میں نے بقول پطرس بخاری ایسے کتے بھی دیکھے جو بہت ہی کتے تھے اور ایسے بھی جو نہ ہونے کے برابر کتے تھے یعنی بالترتیب گدھے اور طوطے کی جسامت کے کتے۔ بہت دفعہ جی چاہا کہ مالکان سے دریافت کروں کہ انھوں نے یہ کتے کہاں سے اور کتنے میں بنوائے ہیں مگر روسی زبان سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے یہ آرزو دل ہی میں رہی۔ ان کتوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ بھونکتے نہیں۔ ایک دفعہ (وسطی ماسکو میں ایک تاریخی تالاب) پر ایک کتا بھونک پڑا۔ یہ ایک ایسا انہونا واقعہ تھا کہ وہاں سیر کے لیے آنے والے لوگوں نے یوں مجمع لگا لیا جیسے ہمارے ہاں عموماً مداریوں کے گرد لگ جاتا ہے۔ کتے کی مالکہ یوں شرمندہ شرمندہ لوگوں سے کتے کی اس ناخلفی پر معذرت خواہ تھیں جیسے کتے کی مناسب تربیت نہ کر کے ان سے بہت بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہو۔

پطرس نے اپنے شہرہ آفاق مضمون میں اس ممکنہ خدشے کا اظہار کیا تھا کہ جانے کب ایک کتا بھونکنا بند اور کاٹنا شروع کر دے۔ تو آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ جب یہ کتے بھونکنے کی زحمت ہی گوارہ نہیں کرتے تو کاٹنے کے بدرجہ اُتم کٹھن مرحلے سے کیا خاک گذریں گے!۔ اب یہ معلوم نہیں کہ یہاں کے کتوں کے اس تہذیبی ارتقا پر ان کی تعریف و توصیف کی جائے کہ انہیں مطعون کیا جائے۔ ہمارے ہاں کے مروجہ نظریات کے بموجب تو ان کتوں کی مذمت کی جانی چاہیے کہ بھونکنے اور کاٹنے کی صلاحیت نہ رکھنے پر تو کتے کا مقصدِ حیات ہی فوت ہو جاتا

راجہ عبدالقیوم

ہے اور اس کی وجہ آفرینش ہی سمجھ نہیں آتی۔

ایک بار اپنے فلیٹ کو جانے والی لفٹ میں سوار ہونے کو تھا کہ اس میں ایک معمر خاتون اور ان کے ساتھ بلا مبالغہ ریچھ کی جسامت اور شکل و شباہت کا ایک کالے اور بھورے رنگ کے درمیان کے کسی رنگ کا کتا دیکھا۔ لفٹ یوں بھی بہت چھوٹی ہے اور مجھے جانا بھی تیسری منزل تک ہی ہوتا ہے چنانچہ میں نے فوری طور پر لفٹ میں سوار نہ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر اسی دوران اس کتے، جس کے آغاز اور اختتام کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا، انتہائی غیر کتیانہ مگر بے حد نرم پچ پچ، چچ چچ یا تچ تچ کے درمیان کی کسی آواز میں مجھے مخاطب کیا۔

ماضی میں اس مخلوق کے ساتھ تلخ تجربات کی روشنی میں غیر ارادی طور پر میں لفٹ کے دروازے سے کئی قدم دور ہو گیا مگر خاتون نے روسی تہذیب و اخلاق کے مظاہرے کی جیسے قسم کھا رکھی تھی اور یوں بھی میرا یہ عمل اس کے کتے کے عمومی اخلاقی رویے کے بارے میں غلط تاثر اور غیر حقیقی غلط فہمیوں کو بھی جنم دے سکتا تھا۔

چنانچہ اس نے انتہائی مہذب لب و لہجے میں مجھے بہ زبان روسی مطلع کیا کہ کتے کا رویہ اور زبان جارحانہ نہیں مفاہمانہ بلکہ دوستانہ تھی اور اس کی حرکات و سکنات اور انداز نشست و برخاست سے اس کی صریحاً تصدیق ہوتی تھی سو میرا رویہ بھی مثبت، غیر متعصبانہ بلکہ دوستانہ ہونا چاہیے۔

یاد رہے کہ خاتون کی ساری گفتگو (جس کا ایک لفظ بھی مجھے سمجھ نہیں آیا) کا یہ لب لباب میں نے ان کے چہرے کے تاثرات، آواز کے زیر و بم اور ملتجیانہ کھڑے ہونے کے انداز سے اخذ کیا ہے اسے کسی بھی طور لفظی یا حقیقی ترجمہ تصور نہ کیا جائے۔

خاتون کے اس لفٹ میں سوار ہونے کی وجہ سے میں اس نتیجے پر پہنچنے میں حق بجانب تھا کہ میں کسی نہ کسی درجے میں ان کا ہمسایہ تھا اور ہمسائے کے حقوق تو مسلمہ ہیں اور ہمسائے کی ناراضگی کئی طرح کے خطرات کی حامل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ میں نے دل کڑا کر کے لفٹ میں سوار ہونے کا ارادہ کر لیا۔ اس مرحلے پر مذکورہ کتے کے مناسب طرز عمل نے میری ڈھارس بندھائی اور مجھے محتاط انداز میں لفٹ میں سوار ہونے پر آمادہ کیا۔ اس سے خاتون کا چہرہ کھل اٹھا اور فاتحانہ انداز سے چمکنے لگا۔ انھوں نے بڑے پیار سے اپنے کتے کو دیکھا اور اس کے اخلاق عالیہ اور اوصاف حمیدہ پر اس کی پیٹھ تھپک کر داد دی۔ مجھے یقین نہیں کہ اتنے بڑے بالوں اور اتنی موٹی کھال تک معمر خاتون کے منحنی اور استخوانی ہاتھوں کی داد پہنچ پائی مگر اس کے بعد کتے کے پر سکون انداز نشست سے میری جان میں جان آئی پھر بھی لفٹ کے دروازے کے کھلنے پر میری برق رفتاری خاتون کے لیے بھی اچنبھے کی بات تھی!

اتنے جسیم مگر حلیم کتے، جس کے اول و آخر کا پتہ لگانا اس کے لمبے بالوں کی دبیز تہہ نیز دم اور تھوتھنی کی مکمل عدم موجودگی کی وجہ سے بہت مشکل تھا، سے سرسری تعارف کے چند روز بعد میرا سامنا ایک ایسے کتے سے ہو گیا جو اپنی مالکہ کے لیے اوور کوٹ کی بیرونی اوپر والی جیب (جس میں کچھ دانشور اپنے قیمتی قلم لگا رکھتے ہیں) سے سر نکال کر گھما گھما

کر اور بالکل گلہری جیسی آنکھیں مٹکا مٹکا کر بیرونی دنیا کے عمیق مشاہدے میں مصروف تھا۔ اس کتے کو کتا کہنا یا تو کتے کی توہین ہے یا گلہری کی! اس کی جسامت تو ایک اچھے اور کھاتے پیتے ماحول میں پلی بڑھی خوش حال اور صاحب جمال گلہری جتنی تھی مگر دیگر اہم خصوصیات میں یہ کتا (اگر یہ کتا ہی تھا) گلہری سے بہت مختلف تھا۔ اس نے اپنے سر اور دونوں نسبتاً لمبے لمبے کانوں پر بالوں کے سنورے سنورے گچھے سجا رکھے تھے۔ اس کی آنکھیں ہو بہو الو کی آنکھوں جیسی بڑی بڑی اور زرد تھیں جبکہ پتلی دم بالکل آخر میں جا کر اچانک بالوں کے ایک بڑے گول اور چوکور کے درمیان کی کسی جیومیٹریکل شکل کے گولے میں تبدیل ہو گئی تھی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ سر اور کانوں کے بالوں کی رنگت یکسر مختلف یعنی بالترتیب بھوری اور سفید تھی۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کتے کے بنوانے پر مالکن نے کثیر رقم خرچ کی ہو گی کہ ایسے عجوبوں پر فطرت تو اپنا وقت صرف نہیں کرتی۔ اس اور اس طرح کے مختلف رنگ و نسل، اشکال اور نوائح کے بے شمار کتے دیکھنے کے بعد میری رگ اشتیاق پھڑکی اور میں نے روس میں کتوں پر تحقیق و جستجو کی ٹھانی۔ موضوع وسیع، وسیع اور پیچیدہ تھا جبکہ وقت مختصر، وسائل محدود، اور جان ناتواں! پاکستانی نفسیات کے عین مطابق کارزار تحقیق میں بھی کوئی مختصر راستہ (شارٹ کٹ) ڈھونڈنے کی بھرپور کوشش کی اور یوں ایک دن کتوں کی نمائش (Dog Show) میں جا نکلا لیکن ٹھہریے، مجھے اس کتے کا اجمالی جائزہ لینے دیجیے جو ابھی ابھی ایک خاتون چراشی پرادی (تالاب) پر چہل قدمی کرانے لائی ہیں۔

اس کی ٹانگیں باقی جسم سے کافی لمبی ہیں اور چہرہ ہو بہو چمگادڑ کے چہرے سے ملتا جلتا ہے (ویسے آپ کو معلوم ہو گا کہ چمگادڑ کا چہرہ ہو بہو کتے کے چہرے سے ملتا ہے ہاں مگر کتے کا چہرہ معیاری (standard) ہونا چاہیے۔ کیونکہ چمگادڑ کا چہرہ ہمیشہ معیاری ہوتا ہے)، جبکہ گردن مقابلتاً طویل مگر مہین ہے۔ ٹانگوں کا رنگ سفید، چہرہ بھورا، آنکھیں نیلی اور مزاج میں تیزی و طراری۔ مگر میں نے آپ کو اس کے جسم کے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں! اس کتے کی طوالت محتاط اندازے کے مطابق دم کی نوک سے چونچ کے سرے تک ۱۲- انچ سے زیادہ ہرگز نہیں اور اونچائی یقیناً ۵۔۱ انچ ہے۔ وزن حتمی طور پر آدھا کلو ہے۔ (حال ہی میں خوراک نہ کھانے کی صورت میں، بصورت دیگر اس میں چند اونس کا اضافہ قرین قیاس ہے)۔ معلوم نہیں اس کتے کا یہ منفرد تناسب حاصل کرنے کے لیے جینیات کے ماہرین کی کتنی نسلوں نے شبانہ روز محنت سے اپنی زندگی اجیرن کی ہو گی۔ اس خدشے کے پیش نظر کہ آپ میری باتوں کو غلو پر محمول کریں گے، میں نے اپنی بات کے ناقابل تردید ثبوت کے طور پر، کتے کی مالکن کی پیشگی اجازت سے قریبی تصاویر لے لی ہیں تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت پیش بھی کی جا سکے:

صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

☆☆☆☆☆

توانائی

ایک کڑکتی گونج، لپکتا کوندا آنکھوں اور کانوں کے رستے
دل دھڑکاتا ہے
ایک سمیع بصارت، تن میں بجلی کی رَو بن کر دِل دھڑکاتی
ہے
نَس نَس میں خُونی لہریں متلاطم رکھتی ہے
خُون کا جھاگ بَدن کے ساحل سے ٹکراتا ہے
آنکھوں میں ڈورے سج جاتے ہیں
کانوں کی لَو میں خون دھمکنے لگتا ہے
رنگوں کی دنیا پر پیار کے رنگ گلال مثال برسنے لگتے
ہیں

کچھ لوگوں میں پیار کا جذبہ اتنا شدید ہُوا کرتا ہے کہ دُنیا اُن
کے پیار کی چوگانی کے آگے میداں
بن بن کر بچھ بچھ جاتی ہے

وہ دنیا کے باشندے کہلاتے ہیں
وہ اپنی مٹّی کی خوشبو سے دنیا بھر کو مہکاتے ہیں
اتنی توانائی کے حامل لوگ بہت کم ہوتے ہیں

جن کی ستارہ آنکھ کا کاجل، لوگوں کے غم ہوتے ہیں
ایک سمیع بصارت سے جو آنکھوں کو نم رکھتے ہیں
درد بہت رکھتے ہیں لیکن رنج بہت کم رکھتے ہیں

خالد احمد

9 مئی 2023

بہت رویا!
بہت رویا!!
یہ دل روتا رہا برسوں تلک
ڈھا کہ کے گرنے پر
مگر اب کے تو
فرطِ غیظ میں پاگل،
کسی کے ورغلائے،
آتشِ نفرت کے بھڑکائے ہوئے
اپنے ہی نادانوں کے ہاتھوں سے
گرا ڈالے گئے
زرّیں نشاں اپنی وفاؤں کے
جلا ڈالے گئے
شہ بادباں روشن دِشاؤں کے
بجھا ڈالے گئے تارے
گھنی شُبھ کہکشاؤں کے
میں اِس ہونی کے انگاروں پہ استادہ
خلاؤں کے اُدھر
کس لازماں میں گھورتا جاتا ہوں
باہر ہی نہیں،
اندر سے بھی بدصورتا جاتا ہوں
اک گمبھیر سکتے میں ہوں
اپنے آپ میں واپس نہیں آتا
مجھے مارو
خبردارو! مجھے مارو
زیاں کارو! مجھے مارو
مرے پیارو! مجھے مارو
مجھے رونا نہیں آتا

جلیل عالی

مرگِ مسلسل

مری زمیں پہ حکومت ہے کیسے لوگوں کی!
کوئی مرے یا جیئے، ان کو کچھ نہیں پروا!

یہیں کہیں پہ وہ آدرش دفن ہو شاید!
حیاتِ نو جسے دینے کی کوششیں کرتے
زمیں کا رزق ہوئے شہر بھر کے دانشور
مگر جو بوجھ زمیں کا ہیں، وہ نہیں مرتے!

اور اب صدائیں یہ آتی ہیں چاروں جانب سے
کہ اس زمیں کے مقدر سے جا چکی دانش
قیامتیں یہاں اتریں یا زلزلے آئیں
وہ بے حسی ہوئی طاری، کہیں نہیں جنبش!

مری زمیں پہ صدائیں یہ ہو گئی ہیں مقیم
نہ ختم ہوتی ہوئی ایک بد دُعا کی طرح
طویل کم نگہی جیسی اک سزا کی طرح
ابد سے پہلے کہاں ختم یہ عذاب الیم!

مری زمیں پہ حکومت ہے کیسے لوگوں کی!
کوئی مرے یا جیئے، ان کو کچھ نہیں پروا!

نسیمِ سحر

تسلسل

اگرچہ موت کی گہری گھنی خاموش وادی میں
ہماری عمر بیتی ہے
مگر اب تک ہمارے جسم کے اندر
کوئی شے
خواہشِ لاانتہا کا خون پیتی ہے
پرانی عادتوں کا زہر رگ رگ میں رواں ہے
ابھی تک چین کی نعمت مقدر میں کہاں ہے
پیالہ ہاتھ سے چھوٹا نہیں اب تک!
طلسمِ زندگی ٹوٹا نہیں اب تک!!

بہت مصروف ہو شاید

کبھی سوچو کبھی سمجھو
گلابوں کے لیے
کیوں تتلیاں بے تاب رہتی ہیں
چکوروں کو ہوا الحق جنوں کیسا
چمکتے چاند تک پہنچیں نہ پہنچیں
سلسلہ رُکتا نہیں اُن کی اڑانوں کا
ہوا و ابر کی یکجائی میں
کس بھید کے آثار ملتے ہیں
مہکتے پھول خوشبو کی زبانی
کون سے پیغام کی ترسیل پر
معمور ہیں فطرت کی جانب سے
زمیں محور پہ گردش کر رہی ہے
کیا سبب اس کا نہیں کوئی
فلک خیمہ نظر آتا ہے اُس سے
باندھ رکھے ہیں ستارے کن طنابوں نے
رہا کرتی ہے کیسی گفتگو
موجوں سے دریا کی
پرندے چاہے دن سارا
تلاشِ رزق میں بھٹکیں
کشش کوئی تو ہے ایسی
انھیں پیڑوں پہ اپنے گھونسلوں کی سمت لاتی ہے
تمھارے پاس کم ہے وقت
ایسے مسئلوں پر غور کرنے کا
بہت مصروف ہو شاید

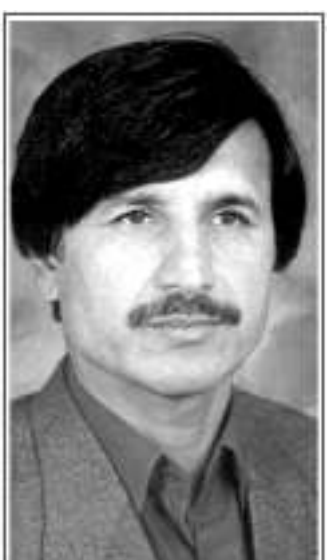

گلزار بخاری

خودسوزی کرنے والی اٹھارہ سالہ آمنہ کے نام

صفدر صدیق رضی

انصاف

کیا راستے میں کھلا پھول ہے
کوئی بھی توڑ لے

عدل

کیا راہ کے پیڑ کی چھاؤں ہے
کوئی بھی اوڑھ لے

حق

برستا ہوا ابر پارہ نہیں
سب کو سیراب کر دے

کبھی رحم

خیرات کی طرح بٹتا نہیں
سب کے دامن کو بھر دے

سوائے بنتِ مریم!

تری آتشیں خاک سے
اب زمیں پر شب و روز
آتش فشاں جنم لیتے رہیں گے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کچھ سانس بچ رہے تھے سو وہ سانس بھی لیے
وعدہ خلاف تھے ، سو ترے بعد جی لیے

وبا کے دنوں میں

وہ اک بے شکل جرثومہ کہ جس نے
تمہارے آپسی ناطوں کو پیسا
تمہاری حس کو ایسے پی لیا ہے
کہ اب تم میں محبت سونگھنے اور درد سہنے کو
رہا کچھ بھی نہیں ہے!!
یہی تم چاہتے تھے ناں؟

سماجی ربط سے کٹ کر
مصافحے سے بہت ہٹ کر
گلے ملنے، ہتھیلی چومنے اور پاس آنے سے
تمہیں ابکائی آتی تھی
تمہیں لگتا تھا کہ وہ تحقیر میں
اور تم کسی سطوت میں کھلتے ہو
یہی تھی ناں کہانی؟

تمہیں آنکھیں ملانے سے عجب الجھن سی ہوتی تھی
سو تم کو ماسک نے پہچان سے محروم کر ڈالا
تمہاری حد جو پچھلے دور میں بے حد کٹاری تھی
کہیں محدود کر ڈالا

تمہارے ہونٹ کی جنبش، نگاہ حسن کی آتش
سبھی معدوم ہو بیٹھیں
تمہیں شیریں بیانی سے بڑی دہشت جو ہوتی تھی!!

یہی اجسام ہیں گھر کے
جنہیں مدت ہوئی،
دیکھا نہ تھا تم نے
تمہیں فرصت کہاں تھی تب!
کتاب زیست پر تم روز کاروبار لکھتے تھے
کبھی اس ملک ہوتے تھے، کبھی بیرون رہتے تھے
تمہیں بچوں کی
صورت، عمر، قامت، کچھ نہ بھاتا تھا
فقط ایوان بھاتے تھے
مگر کالے کلوٹے اس کریہہ الشکل فتنے نے
وبا کا روپ لیتے ہی
تمہارے روز و شب کو اڑدھے کی نوک
سے تاراج کر ڈالا

فرخندہ شمیم

تمہیں رشتوں کی بچھڑی کونج میں بے ڈر اڑا ڈالا
تمہیں ادراک ہے اس کا؟

گمان کبر نے تم کو ہمیشہ ناز میں رکھا
زماں کو ہر گھڑی صدقات کا چہرہ دکھاتے تھے
کبھی حاجت روائی کا اسے مژدہ سناتے تھے
زکاتیں خوب دیتے تھے، بہت وڈیو بناتے تھے
مگر پچھلے برس آئی وباء کے اس زمانے میں
تمہیں راشن قطاروں میں کھڑے مخلوق نے دیکھا

کبھی وہ وقت تھا تم دینے والوں میں نمایاں تھے
مگر تصویر میں اب لینے والوں میں نمایاں ہو،

خدائے لم یزل کے قرب کی آسان ہیں شرطیں
چھپی نیکی، ریا سے پاک خلق عام کی خدمت
مناجاتیں لبوں سے دامن دل کو بھگوتی ہیں
انہیں دست دعا کے سبز گھر میں اب تو آنے دو
معافی عام ہونے دو!

ناخواندہ بھی خواندہ

میں جب بھی نظم لکھنے بیٹھتا ہوں
اندھیرے ہی میں لکھتا ہوں
اندھیرے میں لکھی نظموں کو لکھنا بھی نہیں پڑتا
سو میرے جیسے، جو لکھ پڑھ نہیں سکتے
اندھیرا سب سے اچھی نظم ہے اُن کی
اچانک گفتگو کے غیب میں آغاز ہوتی ہے
کوئی کپڑوں جلا، قرنوں جلا، اوقات کا کالا
شروعِ نظم سے مصرع بہ مصرع اپنی آوازیں لگاتا
خاص تسبیحوں کو گاتا آتا ہے
اور نظم کے سارے ابد آباد تک میں گھل سا جاتا ہے:
چلو.....! گھنگرالے کالے سے یہاں
گالی پہ گالی کون کھائے گا
اِدھر سے گالی چلتی ہے
اُدھر ہر سطر استبداد چل پڑتی ہے
دو اور دو کے جوڑوں میں
اِدھر سے گولی چلتی ہے کہ گالی کس نے دی؟
اور اُس طرف سطروں کی سطریں،
ٹولیوں میں جھول جاتی ہیں کہ ہم نے دی!
ورق کے وسط ہی میں نظم کا بھی وسط آیا
درمیاں آیا اندھیرے کا
یہاں پر نظم کو اک بارہ حرفی آ پکڑتی ہے
کوئی بارہ دری ہے، جس کا اپنا درمیاں ہے
شروع و خاتمہ کے، مشرقوں کے، مغربوں کے
اِس کے اِتنے مسئلے ہیں
کہ جتنے نظم کے ہیں
مؤرخ بات پوری کرنے کی جلدی میں ہے
ابھی کچھ دیر میں،
بس چار چھے چالوں کی دوری پر
مگر اِک ایک کر کے بارہ دروازوں پہ
بارہ باتوں کے پردے گرائے گا
اندھیرے کے مکمل ہونے کا اعلان ہوگا
نظم کا انجام ہوگا!

شاہین عباس

نوحے کم تھے

رخشندہ نوید

نوحے کم تھے

امانتاً دفن کر دیا تھا کہ نوحے کم تھے

ابھی علم رنگ آنچلوں کی کمی تھی ماتم کناں سروں پر!

امانتاً دفن کر دیا تھا

کہ آنسوؤں کی رواں دواں نہر بند توڑے

طویل صف میں جلوس احباب دوستاں سے

لپٹ کے پلو کوئی نچوڑے!

وہ گہرا دکھ جسکی یاد کا

اک مزار تعمیر ہوگا دل پر

امانتاً دفن کر دیا تھا

کسی گھڑی اہتمامِ محفل میں

اپنا یہ دُکھ نئے سرے سے

کسی نئی ماتمی فضا میں، دوبارہ پھر دفن کرنا ہوگا

ابھی تلک غم کی روح بے چین پھر رہی ہے

کچھ اتنے برسوں نے مل کر آنسو جمع کیے ہیں

ہوا نے چُن چُن کے نوحے پلو میں پھر سے باندھے ہیں،

پھر دوبارہ سے سینۂ درد چاک ہوگا

اور عشق کی قبر پھر بنے گی

امانتاً دفن کر دیا تھا کہ نوحے کم تھے

ہم وہیں تھے

غبارِ جاں میں
شعور جس دم پنپ رہا تھا
تو ہم وہیں تھے
وہ جب اندھیرے نئے اجالوں میں ڈھل رہے تھے
زمیں کی خشکی کو جب سمندر نگل رہے تھے
تو ہم وہیں تھے
وہیں کھڑے تھے
جہاں پہ آدم زمیں پہ اترا
تلاشِ حوا میں چل پڑا تھا
جہاں پہ نمرود
ایک مچھر سے ہار کر
جوتے کھا رہا تھا
جہاں پہ فرعون
اپنے لشکر کے ساتھ
پانی میں بہہ گیا تھا
تو ہم وہیں تھے
وہ جب ابابیلیں
جوق در جوق آ رہی تھیں
اور ہاتھی والوں پہ بارشِ سنگ کر رہی تھیں
تو ہم وہیں تھے
ہاں ہم وہیں تھے
جہاں پہ کربل سجی ہوئی تھی
مگر وہ دن اور آج کا دن
ہم ایسے لوگوں کے سامنے ہیں کہ جن کی آنکھوں میں
اتنی طاقت نہیں رہی کہ ہمارے چہروں کو دیکھ پائیں
یہ لوگ وہ ہیں جو ساری باتوں سے آشنا ہیں
جو خوش گمانی میں مبتلا ہیں کہ وہ خدا ہیں

سید تیمور کاظمی

لنچ باکس

سُنا ہے
کل رات
نظم برہنہ کر دی گئی

شہر میں
بھوک کے باعث
بے عزتی کی تپش سے
شرفا جھلس گئے

اب تازہ ہوا کے جھونکے
موقع پرستوں کے گلے میں
جوتوں کے ہار ڈالیں گے

وہ لڑکی
برین واش ہونے کی اذیت کا
لطف اُٹھا رہی ہے

تم خبروں سے
کوسوں میل دُور
سچ کے منظر نامے سے
مزید کسے غائب کرو گے

لوڈ شیڈنگ میں
روشنی کے ہاتھ
اندھیرے کے گریباں کی جانب
بڑھ رہے ہیں

احتیاط سے
میرے گھر کی تلاشی لو
تُم میری کمزوری کا
لبِ لُباب جانتے ہو

مجھے لنچ باکس کی خوش بو سے
خالی دن
آوازیں دے رہا ہے
اور میں۔۔۔ نیند کی حراست میں
بے یقینی کا تاج محل گرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں

امجد بابر

''بنجر''

فرح شاہد

دل کی بنجر زمیں پہ

بظاہر سبز و شاداب نظر آتے پھول
اندر سے سیاہ و بے جان ہوتے ہیں
غمِ ہجراں کی تیز آندھیاں
شادابی و نرمی چھین لیتی ہیں
بجز خارِ پریشاں کے
جو پاؤں زخمی کرتے ہیں مسافر کے

دل کی بنجر زمیں پہ
خوشی کا پھول کب کھلتا ہے؟
یہاں نسیم بہاراں نہیں چلتی
خزاں کا راج رہتا ہے
سرد موسموں کی سختی سہتے سہتے
بے رخی کی تلخی سہتے سہتے
پھول نیلے پڑ جاتے ہیں
پتے پیلے پڑ جاتے ہیں

فرح دل کی بنجر زمیں
کب آباد ہوتی ہے؟
کب شاداب ہوتی ہے؟

معذرت

اے مرے پیارے شاعر
مرے مسئلے کا کوئی حل بتا
میں نے بچپن سے اب تک لطافت سنی
اور لطافت پڑھی
داستانیں رقم اس کی جتنی ہوئیں
میں نے سب ہی پڑھیں
یہ بھی دیکھا کہ رومر کی جنت کہاں کھو گئی
اور وہ رویا نہیں
میر کے غم کو جانا تو آنکھوں سے اشکوں
کی لڑیاں اترنے لگیں
میں نے غالب کے ہر اک تخیل پہ
برسوں تدبر کیا
راز کتنے تھے جو منکشف ہو گئے
اور کئی رہ گئے
میں نے اقبال و رومی کے نقشِ قدم
ناپ کر دم بہ دم
روح کیا ہے؟ یہ سمجھا
تو مجھ پر خدا سے تعلق کھلا
روح مٹی میں شامل ہوئی کس طرح
مجھ کو جتنے بھی اعزاز بخشے گئے
مجھ پہ کھلتے گئے
کہکشائیں مری راہ کی دھول لگنے لگیں
.....پھر مجھے ایک دن
جب تری ماڈرن شاعری کی کتابیں ملیں
کیا بتاؤں، عجب کیفوس جو بنا!
ہر غزل اک برہنہ طوائف کی مانند
گھنگرو پہن کر تھرکنے لگی
تیرے ہر مصرعے سے چھنا چھن، چھنا چھن،
دھما دھم، دھما دھم کی آواز آنے لگی
تب تری شاعری
اپنے بچوں سے مجھ کو چھپانا پڑی
تو نے جو کچھ لکھا
سب خدا کے اصولوں سے تھا ماورا
تو نے جلدی سے مشہور ہونے میں کیا کر دیا!
آخرش ایک دن
ایک نقاد کانوں کو چھو کر یہ کہنے لگا:
''شاعری پر بہت ہی کڑا وقت ہے
.....اک برا وقت ہے''
کیا کہوں جینز کے چاک تک تو نے گنوا دیے
شاعری میں تو بند قبا لے کے آیا
علاوہ ازیں.....
تو نے وہ تک لکھا ہے جو کہنے کے قابل نہیں
سو، مرے شاعرِ محترم، معذرت
تیری جدت بھری شاعری کی برہنہ کتابیں
مرے گھر میں رکھنے کے قابل نہیں!
اس لیے معذرت،
اور بہت معذرت

صغیر احمد صغیر

فرحت پروین کی آواز کے لیے

تیری آواز اگرچہ نہیں میری آواز

لیکن اِس میں میرے جذبوں کی مہک شامل ہے

ماں کی ممتا کی طرح نرم شام کی طرح شفق رنگ

مور کے پَر کی طرح نازک تر

تیری آواز پہ قُربان

نقرئی ساز، صبا، گیت، ہوائیں، جھرنے

تیری آواز کے ہونے کا پتہ دیتے ہیں

یہ پرندے بھی سرِ شام چہک کر اکثر

تیری آواز میں آواز ملا دیتے ہیں

ریحانہ قمر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک قہقہہ کام کر گیا تھا
ہر شخص بہ چشمِ تر گیا تھا

نثری نظم

کتے آسمان کی طرف منہ کر کے بھونک رہے ہیں
فضا میں اک نامعلوم سی
دہشت طاری ہے
گھٹن
سے
سانس رکی جاتی ہے شائد
کچھ ہونے والا ہے
نامعلوم اداسی
مایوسی کا لبادہ اوڑھے
گھر کے آنگن میں اتر آئی ہے
بارش
میں
درختوں کو جلتے دیکھا ہے
سر بریدہ
چہرے موت کی تھاپ پر
رقصاں ہیں
جانے کب تک یہ
رقص جنوں
جاری رہے گا
الو شہر سے ہجرت کر چکے ہیں
پرندوں سے اشجار خالی ہیں
جنگل میں سکوت طاری ہے
شہر میں بھیڑیے گھس آئے ہیں
کوئی
بچانے والا نہیں
انسانی کھال میں
کوئی عفریت ہے
جس نے چہروں سے خوشیاں
چھین لی ہیں
مدت ہوئی کوئی نہیں ہنسا
نفرت بو کر
محبت کی فصل کاٹنا ممکن نہیں
ضد اور انتقام صدیاں نگل لیتے ہیں
وقت کا پہیہ الٹا نہیں چلتا
لبوں کو سی بھی دیں
آنکھیں بولتی ہیں
لگتا ہے شہر کی ہر دیوار پر آنکھیں اگ آئی ہیں
لوگ چہرا چھپاتے پھرتے ہیں
شناخت پریڈ میں پتا چلا
سب نے اک دوسرے سے چہرے بدل لئے تھے
اب کون کس کے لبادے میں پھرتا ہے پتا نہیں
سب کو اپنے چہرے کی تلاش ہے
اس گمشدہ جہان میں
ہمیں اپنی شناخت ڈھونڈنے میں شائد صدیاں لگ جائیں
وقت کی موت واقع ہو سکتی ہے
آنکھیں اندھی ہو سکتی ہیں
خواب مردہ ہو سکتے ہیں
تاریکی گہری ہو سکتی ہے
زندگی کھو سکتی ہے

نائلہ راٹھور

اے شیر دریا

اے شیر دریا، اے سندھو سائیں
نصیب ہوتا ہے، روز مجھ کو
ترا سہارا، ترا کنارا
گزر رہی ہے، یہ زندگانی
ترے سہارے، ترے کنارے
رہے سلامت، مرے پیارے
جوان جذبے مجھے ملے ہیں
تو استعارا ہے زندگی کا
ترنگ تو ہے، امنگ تو ہے
میں سچ کہوں تو، ہے لاج میری
تو پانچ دریاؤں میں بڑا ہے
کہ تان سینہ سدا کھڑا ہے
یہی روانی، یہی جوانی
سدا میں دیکھوں، مری دعا ہے

عاصم بخاری

حیا کی چادر

زمیں پہ اترے کوئی ستارا
کوئی شرارا
کسی کی آنکھوں کا
تم کو لینا ہو گر سہارا
کوئی جو دل تم کو دے کے دیکھے
تمھارے ہاتھوں کو
اپنے ہاتھوں میں لے کے دیکھے
کوئی تمھارے جو ساتھ چلنا۔
پسند کر لے
اگر کوئی
تم کو تھام لے اپنے بازوؤں میں
اگر کوئی تم سے پیار کر لے
تمھاری سانسوں کو
اپنی سانسوں میں زندگی بھر
شمار کر لے
تو ایسا کرنا
کہ اپنے اوپر
کسی سمندر کو اوڑھ لینا
حیا کی چادر کو اوڑھ لینا

سمیرا یوسف

محبت ہو بھی سکتی ہے

محبت ہو بھی سکتی ہے
اگر تم بھول کر شکوے گلے پھر میرے ہو جاؤ
سبھی یادوں کو پھر سے تازہ کر لیں مل کے ہم دونوں
وہ الہڑ پن کی چاہت مسکراہٹ دل کو بھا جانا
وہ تیرا روٹھنا مجھ سے مرا تجھکو منا لینا
یوں سارے غم بھلا لینا میں تجھ سے دور جاؤں تو تم مجھ کو صدا دینا

محبت ہو بھی سکتی ہے
اگر کچھ شعر کہہ دوں میں تری میری رفاقت پر
اگر تو لائے ایماں پھر سے ہم دونوں کی چاہت پر
تو میرا بن کے چل دے راہِ عشقا کی صداقت پر

محبت ہو بھی سکتی ہے
مگر سن اب کے جو ہم کو محبت ہو گئی جاناں
اسے تم کھونے مت دینا کبھی بھی رونے مت دینا
اسے تم پاس رکھ لینا کسی کا ہونے مت دینا

محبت ہو بھی سکتی ہے
اگر اک بار پھر سے زندگی میں تم چلے آؤ

آفرینہ آفریں

مشرف مبشر کے لیے

علم وحکمت کے موتی لٹاتی ہوئی
مسکراتی ہوئی دل لبھاتی ہوئی
ساز چاہت کے ہر سو بجاتی ہوئی
گنگناتی ہوئی
یہ کہانی لکھے
یا سفر اپنا اپنی زبانی لکھے۔۔۔۔
سیر پورے جہاں کی کراتی ہوئی
اس سے کوئی جو رشتہ کبھی توڑ دے
اس جہاں میں اکیلا اسے چھوڑ دے
پیار کی برف سے
صندلی ظرف سے
سارے روٹھے ہوؤں کو مناتی ہوئی
نہ ملے گا کوئی اس کا نعم البدل
جیسے طیبہ کی ہوا ایک روشن رحل
یا کہ دشت عرب میں ہو کوئی سجل
اس کو دیکھا تو انجم کو ایسا لگا
جیسے ہو میرؔ کی کوئی تازہ غزل
اس کی گفتار سے اس کے کردار سے
اس کے اعلیٰ قلم کی ہی تلوار سے
بھولے بھٹکے مسافر کو منزل ملے
اس کا درشن ہوا
دل یہ کہنے لگا
اس کے پاؤں چھوؤں
اس کے مرمریں ہاتھوں کا بوسہ بھی لوں
رب کی اس پہ عطا
ہو گئے مستجاب
اس کی ہر اک دعا
رب نے اس کو ہے کتنا ''مشرف'' کیا
اس کو شہرت ملی
اور اپنے قلم سے ہے رفعت ملی
علم کے نور سے ہی تو عظمت ملی
اس کے دل کا سکوں
اس کی اولاد ہے
جس کے ہونے سے دل اسکا آباد ہے
اس گلستاں میں جتنے بھی گل ہیں سجے
وہ بہت مان سے
اور دل و جان سے
سارے کے سارے
اس پر نچھاور کروں
تو ہمارے وطن کی ہے اک ماہ جبیں
تیرا ظاہر و باطن
ہیں دونوں حسیں
تجھ سا کوئی کہاں؟؟؟؟
تجھ سا کوئی نہیں

رفعت انجم

ماں اور دھرتی ماں کے لیے ایک نظم

اعجاز رضوی

پہیلی بوجھنا جس نے سکھایا
خزاں میں پھول کیسے جگمگاتا ہے بتایا
بتایا،
یہ ہوا، بادل سمندر چاند سورج اور ہمسائے کا آنگن
اپنا آنگن ہے
سو، آنگن کو سجانا ہے، بسانا ہے
میسر آنے والی نیلی پیلی جھنڈیوں کو یوں لگانا ہے
کے سب حق دار ٹھہریں اس سجاوٹ کے
اُسی نے سادہ کاغذ پر لکیروں کی مدد سے اُن ستاروں سے ملایا
جو ستارے آسماں کی اس ہتھیلی پر گرے ہیں
جس ہتھیلی سے فقط آنسو ٹپکتے ہیں
اُسی نے پھول ہاتھوں سے صحن میں دھوپ پھیلائی
اُسی نے دھوپ بالوں سے صحن میں چھاؤں بکھرائی
اُسی نے اُڑتی چڑیا کو ٹھہرنا اور بے خوفی سے چلنا بھی سکھایا ہے
اُسی نے میرے ہاتھوں کو پروں سے مس کیا ایسے
کہ اب تک ہر پرندہ اپنا لگتا ہے
میری عمر رواں کی ساری خوشیاں اس سے وابستہ
میں اس سے پیار کرتا ہوں میں اس کا اچھا بیٹا ہوں
میری ماں ہے میری دھرتی
میری دھرتی میری ماں ہے

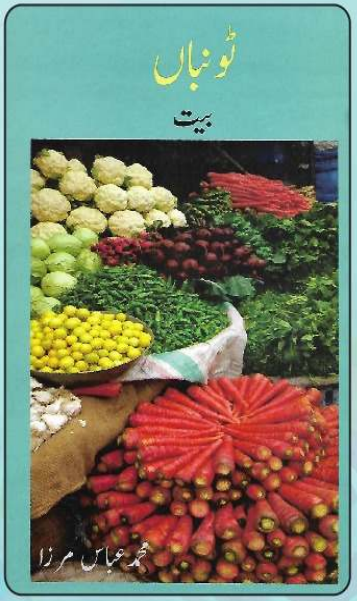

بھیگتی آنکھ کا دُکھ
ڈاکٹر عائشہ ظفر

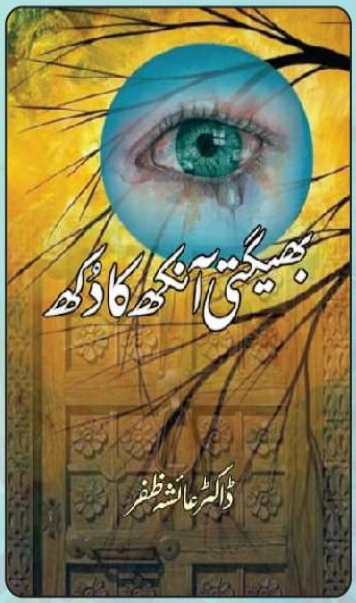

ٹونباں
بیت
محمد عباس مرزا

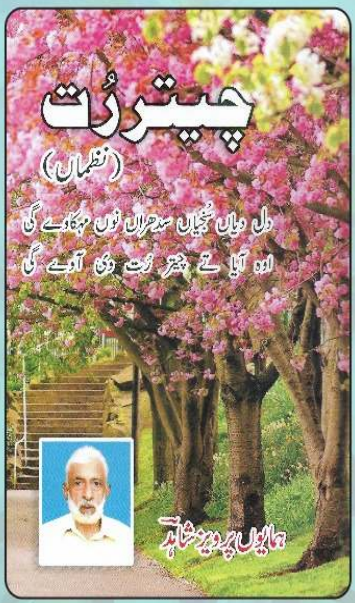

چیتر رُت
(نظماں)
دل دیاں سُنجیاں سدھراں نوں مہکاوے گی
اوہ آیا تے چیتر رُت وی آوے گی
ہمایوں پرویز شاہد

جشنِ جون ایلیا میں جناب عمران منظور، جناب عباس تابش، جناب اعجاز ثاقب اور جناب اعجاز رضوی

جشنِ جون ایلیا میں جناب عمران منظور اور جناب اعجاز رضوی

جشنِ جون ایلیا میں جناب خالد احمد کے فن اور شخصیت پر ایک سیشن میں شریک سامعین